خطبات بہاولپور کا علمی جائزہ

زاد المعاد کے اردو ترجمہ کا سرسری جائزہ

صحیفۂ ہمام بن منبہ کے ترجمہ پر ناقدانہ نظر

افادات مولانا محمد عبداللہ رحمہ اللہ

احمد پور شرقیہ ضلع بہاولپور

تعارف مولانا محمد عبداللہ احمد پوری رحمہ اللہ

(وفات ۱۶ر دسمبر ۲۰۰۶ء)

۲۴ر ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ بمطابق ۱۶ر دسمبر ۲۰۰۶ء کو پاکستان کے ممتاز عالم دین حضرت مولانا محمد عبداللہؒ احمد پوری انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! مولانا محمد عبداللہ ۱۹۲۹ء قصبہ پکالاڑاں (لیاقت پور) کے قریب بستی نور محمد بٹوانی میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی کا نام مولانا نور محمد تھا۔ جو حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی مرحوم کے موقوف علیہ تک کے ہمدرس اور ساتھی تھے۔ مولانا محمد عبداللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی۔ آپ کے اسباق کی بسم اللہ دین پور شریف کی معروف روحانی شخصیت حضرت میاں عبدالہادیؒ نے کرائی۔ الہ آباد مڈل سکول سے آپ نے ساتویں تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں جامعہ عباسیہ بہاولپور میں داخلہ لیا اور جامعہ کی انتہائی ڈگری ''علامہ'' حاصل کی۔ جامعہ عباسیہ میں مولانا غلام محمد گھوٹویؒ، مولانا محمد صادقؒ، مولانا عبیداللہ بہاولپوریؒ اور دیگر حضرات سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے دورہ تفسیر پڑھنے کی بھی سعادت حاصل کی۔ پاکستان کے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے بھی اجازت حدیث حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی ان دنوں جامعہ عباسیہ کے زیر اہتمام سرکاری مدارس وسکولز کا انتظام تھا۔ تب آپ ان مدارس سے وابستہ ہوئے۔ مدرسہ عربیہ فاضل، احمد پور شرقیہ کے صدر مدرس (ہیڈ ماسٹر) بھی رہے اور سرکاری ملازمت کی پوری مدت آپ نے احمد پور شرقیہ میں گذاری۔ اس حوالہ سے آپ کو حضرت مولانا علامہ محمد عبداللہ احمد پوری کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ تمام اہل علم حضرات کی آنکھوں کا تارا تھے۔ حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ، حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا حافظ سید عطاء المنعم شاہ صاحبؒ سے آپ کے مثالی تعلقات تھے۔ ۱۹۹۲ء میں آپ

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ ۲۰۰۲ء تک احمد پور شرقیہ رہے۔ اس کے بعد اپنے آبائی گھر پکالاڑاں بستی نور محمد بٹوانی میں رہائش پذیر ہو گئے۔ مولانا محمد عبداللہ صاحب بہت محقق اور مدقق عالم دین تھے۔ آپ کی ثقاہت علمی کا اعتراف حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ فرماتے تھے۔ جب عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت نے آئینہ قادیانیت نامی کتاب وفاق المدارس کے نصاب کے لئے مرتب کی تو حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری کے حکم پر آخری خواندگی کے لئے اس کتاب کو حضرت مولانا محمد عبداللہؒ صاحب کے پاس بھجوایا گیا۔ آپ نے دقت نظر کے ساتھ اس پر کام کیا اور بہت ہی باریک خامیوں کی نشاندھی سے ممنون فرمایا۔ کاروان جنت، خطبات بہاولپور کا علمی جائزہ، صحابہ کرامؓ کا مقام اور ان پر تنقید؟ جیسی کئی علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ مؤخر الذکر دو کتابوں میں بالترتیب پروفیسر حمید اللہ حیدر آباد دکن اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے بعض تسامحات پر بھرپور علمی گرفت کی۔ حضرت مولانا حبیب اللہ گمانویؒ کے قائم کردہ جامعہ حبیبہ انوریہ کی شوریٰ کے رکن اور کئی جامعات کے سرپرست تھے۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ حضرت مولانا میاں مسعود احمد دین پوری نے پڑھایا۔ خان پور، ظاہر پیر، دین پور، طاہر والی، بہاولپور، احمد پور شرقیہ کے علماء کی بہت بڑی تعداد نے جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ (لولاک صفر ۱۴۲۸ھ)

خطباتِ بہاول پور

کا علمی جائزہ

تالیف

حضرت علامہ مولانا محمد عبداللہ زید حیاتہ

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا جو حق پر قائم ہوگا، جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں ہے:

"عن معاوية (رضي الله عنه) سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول لا يزال من امتي امة قائمة بامر الله، لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتى ياتي امر الله، وهم على ذلك. متفق عليه."

(مشکوٰۃ ص:۵۸۳)

ترجمہ:..... "حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا، آپؐ نے فرمایا کہ: ہمیشہ میری امت میں ایک جماعت اللہ کے حکم پر کاربند رہے گی، نہیں نقصان پہنچا سکے گا اسے وہ شخص جو اسے چھوڑ دے گا یا ان کی

مخالفت کرے گا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہوجائے گی اور وہ اس پر قائم ہوگی۔"

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے:

"سیکون فی آخر هذه الامة قوم لهم مثل اجر اوّلهم، یامرون بالمعروف وینهون عن المنکر ویقاتلون اهل الفتن." (مشکوٰۃ ص:۵۸۴)

ترجمہ:..... "عنقریب اس امت کے آخر میں ایک قوم پیدا ہوگی، جس کا ثواب اس امت کے ابتدائی دور کے لوگوں کے ثواب کی مانند ہوگا، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کریں گے اور وہ اہل فتنہ سے لڑیں گے۔"

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر رہے گی اور دین میں تحریف پسندوں کی تحریف اور باطل پرستوں کی باطل تاویلات کا پردہ چاک کرتی رہے گی۔

بلاشبہ ان ارشادات نبویؐ کے مطابق دنیا میں ہمیشہ کچھ اللہ کے بندے ایسے رہے ہیں، جو اس فریضہ کو نبھاتے آئے ہیں، اور دین متین کے صاف و شفاف چہرہ سے باطل پرستوں کی اڑائی ہوئی دھول اور گرد و غبار کو صاف کرکے امت کے سامنے اسے اصلی شکل میں پیش کرتے رہے ہیں، چنانچہ اس کا مشاہدہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ سابقہ ادیان میں تحریف و تبدیل کا تیشہ چلاکر اس کو مسخ کردیا گیا ہے، اور آج ڈھونڈنے سے بھی اُن کی اصلیت کے آثار کا پتہ نہیں چلتا، اس کے برعکس چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اسلام نہ صرف اسی طرح اپنی اصل شکل میں باقی ہے جس طرح کہ آنحضرت ﷺ نے حضرات صحابہ کرامؓ کے حوالہ کیا تھا، بلکہ اس کے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ میں تحریف و تبدیلی نہیں کی جاسکی، وہ جس طرح آج سے

چودہ سو سال پہلے چمکتا دمکتا تھا، ٹھیک اسی طرح وہ آج بھی تر و تازہ ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی مسئلہ کے بیان کرتے وقت آنحضرت ﷺ نے کسی قسم کا کوئی اشارہ بھی فرمایا تھا تو راویانِ دین حنیف نے اسے بھی جوں کا توں محفوظ رکھا۔

اس لئے جب کسی طالع آزما نے قرآن وسنت یا دین وملت میں کسی قسم کی تحریف کرنے کی کوشش کرنا چاہی تو خادمان دین وشریعت نے نہ صرف اس کی راہ روکی، بلکہ دلائل و براہین کے ہتھیار سے اس کا بھرپور مقابلہ کر کے اسے چاروں شانے چت کر دیا۔

سچ یہ ہے کہ حامیان دین وملت نے شاہراہ اسلام کو دلائل و براہین کے ایسے روشن چراغ مہیا کئے کہ اگر اس میں کسی نکتے اور زیر و زبر کا اضافہ یا اس میں کسی پیوندکاری کرنے کی کوشش کی، تو اسے یکسر مسترد کر دیا گیا۔

پیش نظر مجموعہ بھی اسی سنہری سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کے فاضل مرتب حضرت اقدس مولانا علامہ محمد عبداللہ زید مجدہ نے جناب ڈاکٹر حمیداللہ صاحب ساکن پیرس کے ''خطبات بہاولپور'' کا نہایت عدل و انصاف اور حزم و احتیاط سے جائزہ لیتے ہوئے ان کی فروگزاشتوں کو نہایت خوبصورت انداز اور متین وسنجیدہ اسلوب سے واضح کیا ہے، اور بتلایا ہے کہ موصوف کی علمی رفعتوں کے اعتراف کے باوجود ان کی مذکورہ فروگزاشتیں قرآن وسنت اور اکابر علمائے امت کے موقف سے میل نہیں کھاتیں۔

چنانچہ ''خطبات بہاولپور'' میں درج جناب ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کی جن ذاتی آراء اور قرآن وسنت سے میل نہ کھانے والے مسائل پر مصنف موصوف نے گرفت فرمائی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱:.....کیا عورت مردوں کی نماز میں امام بن سکتی ہے؟

۲:.....اسلام اور موسیقی۔

۳:.....نماز میں سر کا ڈھانپنا۔

۴:.....ڈارون کا نظریۂ ارتقاء۔

۵:.....کیا استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ لازم ہے؟

۶:.....کیا زکوٰۃ کی رقم تعمیر مسجد میں لگائی جاسکتی ہے؟

۷:.....کیا انسانی اعضاء بطور عطیہ یا قیمتاً دینا جائز ہے؟

۸:.....سیرت نبویؐ کی روشنی میں انشورنس جائز ہے؟

بلاشبہ ان مسائل میں ڈاکٹر صاحب کا موقف چودہ صدیوں کے اکابر اور نصوص شرعیہ سے یکسر خلاف ہے، مگر داد دیجئے حضرت مولانا علامہ محمد عبداللہ صاحب زید مجدہ کی دیانت کو کہ جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کے علمی مرتبہ و مقام کا پاس کرتے ہوئے ان کے موقف کی نہایت بدلل انداز میں تغلیط کرتے ہوئے نہایت خوبصورت اور شاندار انداز میں قرآن وسنت اور اکابرین امت کے موقف کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا ہے۔

اس مجموعہ کے آخر میں علامہ صاحب کے دو مزید علمی مقالے: ''زاد المعاد کے اردو ترجمہ کا سرسری جائزہ'' اور ''صحیفۂ ہمام بن منبہ کے ترجمہ پر ناقدانہ نظر'' کو بھی افادۂ عام کی غرض سے شامل کیا گیا ہے۔

آج سے تین سال قبل مخدوم مکرم حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب زید مجدہ نے اپنی ذاتی اور نجی خط و کتابت میں حکیم العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ سے اپنے ان مقالات کا تذکرہ کیا تو حضرت شہیدؒ نے آپ کو لکھا کہ یہ مقالے مجھے بھیج دیں، چنانچہ موصوف نے یہ تینوں مقالے حضرت شہیدؒ کو بھیج دیئے اور حضرت شہیدؒ نے اس ناکارہ کے ذمہ لگایا کہ ان مقالات کو پڑھ کر بتلاؤں کہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں؟ ناکارہ نے بالاستیعاب پڑھنے کے بعد عرض کیا کہ بے حد مفید، سنجیدہ اور متین اندازِ تحریر پر مشتمل ہیں، جس پر حضرتؒ نے بھی ان کو سرسری ملاحظہ فرمایا اور حکم

دیا کہ ان کو شائع کر دیا جائے، چنانچہ تعمیل ارشاد میں ان کو کمپوز کرایا گیا، مؤخر الذکر دونوں مقالے تو ماہنامہ ''بینات'' کی زینت بنے، البتہ ''خطبات بہاولپور کا علمی جائزہ'' اب تک کہیں شائع نہیں ہوا، گویا یہ مجموعہ حضرت اقدس شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی خواہش کی تکمیل میں شائع کیا جارہا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر غیر معمولی تاخیر ہوگئی جس پر ہم حضرت مصنف زید مجدہ اور حکیم العصر حضرت لدھیانوی شہیدؒ کی روح سے معذرت خواہ ہیں، امید ہے مصنف موصوف درگزر فرمائیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو قارئین کے لئے باعث ہدایت اور حضرت مصنف و ناشرین کے لئے باعث نجات آخرت بنائے، آمین۔

خاکپائے حضرت لدھیانوی شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

مدیر ماہنامہ ''بینات'' کراچی

۱۴۲۲/۸/۱۵ھ

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	تقریب سخن	۹
۲	حرف آغاز	۱۳
۳	کیا عورت مردوں کی امام بن سکتی ہے؟	۱۵
۴	اسلام اور موسیقی	۲۵
۵	نماز میں سر کا ڈھانپنا	۴۴
۶	ڈارون کا نظریۂ ارتقاء	۴۷
۷	کیا زیورات پر زکوٰۃ لازم آتی ہے؟	۷۰
۸	کیا مد زکوٰۃ کی رقم سے مسجد تعمیر کرائی جاسکتی ہے؟	۷۷
۹	کیا انسانی اعضاء کا بطور عطیہ یا قیمتاً دینا جائز ہے؟	۹۲
۱۰	سیرۃ طیبہ اور انشورنس	۱۰۹
	ضمیمہ:	
۱۱	زاد المعاد کے اردو ترجمہ کا سرسری جائزہ	۱۲۵
۱۲	صحیفہ ہمام بن منبہ کے ترجمہ پر ناقدانہ نظر	۱۴۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریبِ سخن:

دو نقطوں کے درمیان ٹیڑھے خطوط جتنے چاہو ''کھینچ لو'' مگر خط مستقیم صرف ایک ہی کھینچا جا سکتا ہے۔ جیومیٹری کا یہ اصول روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر دین و دنیا کے بڑے بڑے مسائل تک میں ہمیں کارفرما نظر آتا ہے۔ کوئی مسئلہ لے لو، اس میں اعتدال پسندی کے جادۂ مستقیمہ کے علاوہ افراط و تفریط کی بیسیوں شکلیں ملیں گی۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت علی المرتضیٰؓ سے فرمایا:

''تم میں حضرت عیسیٰؑ سے ایک مشابہت پائی جاتی ہے، یہود نے ان سے بغض رکھا یہاں تک کہ ان کی پاکدامن والدہ پر بہتان تراشی کی اور نصاریٰ نے ان کی محبت میں غلو کر کے انہیں اس مقام تک پہنچا دیا جو ان کو حاصل نہ تھا''۔ یہ بیان فرما کر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میری وجہ سے دو شخص ہلاک ہوں گے، ایک میری محبت میں

افراط سے کام لینے والا اور دوسرا بغض میں آ کر افترا پردازی کرنے والا۔

آج ہمارے سامنے کسی بزرگ کا نام آتا ہے تو اس کے بارے میں عموماً دو رائیں سامنے آتی ہیں، ایک افراط کی کہ اس کی ہر رائے اور ہر بات پر ایمان لانا ضروری سمجھا جائے اور اس کے ہر قول و فعل کو درست قرار دیا جائے۔ دوسرا تفریط کا راستہ ہے کہ کوئی کتنی ہی بلند و بالا شخصیت ہو، اس کی ایک آدھ غلطی یا علمی لغزش کو دیکھ کر اس کے تمام محاسن کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے یا اس کی تمام تر علمی خدمات پر پانی پھیر دیا جائے۔ ان کے علاوہ تیسری رائے، خواہ اُس کے ماننے والے کتنی ہی تھوڑی تعداد میں ہوں، ہوتے ضرور ہیں۔ اُن کی رائے میں اصابت اور فکر و عمل میں سنجیدگی کا عنصر غالب ہوتا ہے، وہ حق دار کو اس کا حق دینا ضروری سمجھتے ہیں کسی کی خوبیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کی کوتاہیوں کو ''زلّات'' کی حد تک محدود رکھنا دیانت داری کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔

چودھویں صدی ہجری میں برصغیر پاک و ہند کی سرزمین نے جن عظیم شخصیتوں کو جنم دیا، ان میں ایک نامور بزرگ، جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ہیں، جن کا مولد و منشا ''مرحوم'' حیدر آباد دکن ہے۔ ان کی زندگی کا آخری حصہ فرانس کے دارالحکومت پیرس میں گزرا ہے، جہاں وہ ایک انسٹی ٹیوٹ کے کرتا دھرتا کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پندرہویں صدی ہجری کی استقبالیہ تقریبات کے سلسلہ میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے انہیں یہاں آنے کی دعوت دی جس کو شرف پذیرائی بخشتے ہوئے، وہ یہاں تشریف لے آئے اور مختلف اہم عنوانات پر انہوں نے بارہ خطبات دیئے۔ سرزمین بہاول پور میں ان کی تشریف آوری یہاں کے علمی حلقوں کے لئے ایک سنہری

موقع تھا اور جو خطبات انہوں نے ارشاد فرمائے، وہ بلاشبہ طلبائے علم کے لئے ایک بیش بہا اور گراں قدر علمی ذخیرہ سے کم نہیں.....لیکن انسان خطا کا پتلا ہے۔ ان خطبات میں جنابِ موصوف سے کچھ علمی لغزشیں صادر ہوئیں۔ ان خطبات کے کئی ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اب وہی افراط وتفریط کا معاملہ شروع ہوا، ایک گروہ نے ڈاکٹر صاحب کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو حرفِ آخر کا درجہ دیا اور وہ کسی سنجیدہ تنقید کے بھی روادار نہیں ہیں۔ دوسری طرف ایک طبقہ ان حضرات کا ہے جو ان خطبات کا نام سامنے آنے پر ناک بھوں چڑھا لیتا ہے۔ نامعقول اور غیر سنجیدہ قسم کی حرف گیری شروع کر دیتا ہے۔ یہ دونوں انداز: ''خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدَرَ'' کے حکیمانہ اصول سے انحراف پر مبنی ہیں۔ ان دونوں کے مقابلے میں تیسرا اعتدال پسند طبقہ ہے، جو لغزشوں سے اپنے دامن کو سمیٹ کر چلتا ہے اور: ''خُذِ الحِکْمَةَ اَنّٰی کَانَت'' کے زریں اصول کے تحت صحیح نظریات و افکار کو قیمتی متاع سمجھ کر اس سے استفادہ کی کوشش کرتا ہے۔ بلاریب، یہی حق پرستوں کا شیوہ ہے۔

ہمارے محترم بزرگ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب، نہ صرف ایک صائب الرأی اور سلیم الفکر، قابل اعتماد عالم ہیں، بلکہ دورِ حاضر کے مطابق ''تصنیفی'' صلاحیتوں کے بھی مالک ہیں۔ خطباتِ بہاول پور کے بارے میں متعدد احباب نے اُن سے استدعا کی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے اِن خطبات کا علمی جائزہ لے کر قارئین کے لئے صاحب موصوف کی علمی لغزشوں سے آگاہی آسان بنادیں تاکہ وہ دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی قرار دے سکیں۔ جسمانی عوارض میں مبتلا ہونے کے باوجود مولانا ممدوح نے احباب کی درخواست کو شرفِ قبول بخشا اور چند اوراق تحریر فرمادیئے، جو اس وقت قارئین

کے سامنے ہیں۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اُن کا قلم، مناظرانہ جدل، مسلکی تنگ نظری اور سَفَطَہ پردازی کے عیوب سے پاک ہے۔ قارئین اُن کے فرمودات کو پڑھیں گے تو اپنے آپ کو ہم سے اتفاق رائے پر مجبور پائیں گے۔ واللہ یہدی من یشاء

محمد منصور احمد خاں

(ایم۔اے اسلامیات)

حبیب منزل۔ احمد پور شرقیہ

حبیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز:

پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے مبارک موقع پر اسلامی یونیورسٹی بہاول پور نے پاک سرزمین کو ایک گراں بہا علمی تحفہ ''خطبات بہاول پور'' کے نام سے دیا۔ یہ مجموعہ بارہ خطبات پر مشتمل ہے، جو ملتِ اسلامیہ کے نامور اسکالر جناب ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے یونیورسٹی کے غلام محمد گھوٹوی ہال میں دیئے تھے۔ یہ اس وقت کے یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب عبدالقیوم قریشی کی ایک مستحسن اور قابل قدر کاوش تھی۔ کاش کہ یہ سلسلہ کچھ اور پھیلتا اور امت مسلمہ کے بعض دیگر اکابر اہل علم کے پاکیزہ خیالات سے بھی ملک وملت کو استفادہ کا موقع میسر آتا، لیکن:

لیس کل ما یتمنی المرء یدرکہ

ڈاکٹر صاحب موصوف، ایک بہت ہی شہرت یافتہ اسکالر ہیں اور ان کے یہ خطبات بڑے معلومات افزا ہیں، اس کے باوجود وہ جو عربی زبان کا ایک مقولہ ہے: ''ان لکل جواد کبوۃ و لکل صارم نبوۃ'' (ہر تیز رفتار گھوڑا کبھی منہ کے بل گرتا ہے اور ہر تلوار کبھی خطا کر جاتی ہے)۔ اس کے مطابق کوئی انسان، خواہ علم وفضل میں وہ کتنا اونچا

مقام رکھتا ہو، اس سے غلطی سرزد ہوسکتی ہے۔ ماضی قریب میں ہم نے دیکھا کہ بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان، ڈاکٹر صاحب کے ان خطبات کو حوالہ کی کتاب قرار دیتے ہوئے ان سے استدلال اور استناد کرتے ہیں، مگر ہم ان خطبات کی یہ حیثیت تسلیم کرنے سے معذرت خواہ ہیں۔ کیوں؟ یہی ہم آج کی فرصت میں قارئین کو بتانا چاہتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم پھر گزارش کردیں کہ ہمارا مطمح نظر تنقید برائے تنقید قطعاً نہیں ہے۔ میں دل سے ڈاکٹر صاحب کی قدر کرتا ہوں اور ان کے علمی و تحقیقی کام کو انتہائی وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ آئندہ گزارشات سے مقصود، محض تحقیق حق ہے۔ اِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى۔

واقعہ یہ ہے کہ بے شک ڈاکٹر صاحب، ایک وسیع النظر فاضل، اسلامی قانون کا کافی مطالعہ رکھتے ہیں، ایک بلند پایہ مؤرخ بھی ہیں، لیکن ان کا یہ مقام تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں صفِ اول کے فقہاءِ امت میں لاکھڑا کیا جائے ..... علم حدیث میں تبحر اور مہارت تو دور کی بات ہے، ان پر ایک ''محدث'' کا اطلاق بھی شاید ہی ہوسکے۔ حدیث کے طلبہ، محدث، حافظ، حجۃ، اور حاکم کی فنی اصطلاحات سے بخوبی واقف ہیں، ہماری آئندہ گزارشات ان پر واضح کریں گی کہ علم حدیث میں ڈاکٹر صاحب کا کیا پایہ ہے۔ اور یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہماری رائے کسی تنگ نظری یا ''مولویانہ بخل'' پر مبنی نہیں ہے، بلکہ علوم دینیہ سے خیر خواہی کا مقتضا ہے۔

واللہ علی ما نقول وکیل

کیا عورت مردوں کی امام بن سکتی ہے؟

جناب ڈاکٹر صاحب اس سوال کا جواب ''ہاں'' میں دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ نے ان کے محلے .....اھل دارھا نہ کہ اھل بیتھا..... کی مسجد کا امام مأمور فرمایا تھا جیسا کہ سنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل میں ہے اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے۔ اور یہ کہ ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا۔'' (خطبات طبع چہارم ص:۳۵)

آگے چل کر خطبہ نمبر ۱۲ میں سوال نمبر ۵ اور اس کا جواب بھی قابل ملاحظہ ہے:

''سوال: حضرت ام ورقہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کو آپ ﷺ نے گھر کی عورتوں کا امام بنایا تھا۔ کیا عورت صرف عورتوں کی امامت کر سکتی ہے۔ مردوں کی نہیں؟

جواب: میں اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ صرف عورتوں کے لئے امام بنایا گیا تھا۔ حدیث میں یہ الفاظ ''اھل خاندان کے لئے'' اھل کے معنے صرف عورتوں کے نہیں ہوتے۔ پھر اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کا ایک مؤذن تھا، جو ایک مرد تھا۔ اور مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں کہ ان

کے غلام بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ غلام ان کی امامت میں ہی نماز پڑھتے ہوں گے۔ غرض یہ کہ امامت صرف عورتوں کے لئے نہیں تھی بلکہ مردوں کے لئے بھی تھی۔" (خطبات ص:۴۲)

جناب ڈاکٹر صاحب کے ارشادات کا جائزہ لینے سے پہلے ہم قارئین سے عرض کرتے ہیں کہ وہ نگاہ کو اور گہرائی تک لے جائیں، شریعت مقدسہ کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا عورت کا مردوں کے لئے امام بننا، شریعت کے لطیف اور پاکیزہ مزاج سے کوئی میل کھاتا ہے۔

شریعت مقدسہ کا عمومی مزاج اور عورت کی امامت:

اس سلسلے میں ہم قارئین کی توجہ تین نکات کی طرف مبذول کرائیں گے:

پہلا نکتہ:

اگر عورت مسجد میں جا کر مردوں کی امام بن سکتی ہے تو یقیناً جہری نمازوں میں قرأت بھی جہراً کرے گی اور نماز جہری ہو یا سرّی، تکبیرات تو یقیناً بلند آواز سے کہے گی۔ جب یہ سب کچھ اس کے لئے روا ٹھہرا تو پھر اس کے اذان خود کہنے میں رکاوٹ کیوں ہوتی اور کسی مرد کو اس کے لئے مؤذن مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ شریعت تو یہاں تک حکم دیتی ہے کہ اگر نماز میں امام سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو مرد سبحٰن اللہ کہہ کر آگاہ کریں اور عورت ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے ہاتھ کی پشت پر مار کر مطلع کرے۔ التسبیح للرجال والتصفیق للنساء (بخاری۔ مسلم ج:۱ ص:۱۸۰، وغیرہ) جو عورت غلطی بتانے کے لئے مردوں کی جماعت میں زبان سے سبحٰن اللہ

نہیں کہہ سکتی، وہ آگے کھڑی ہوکر تکبیرات کہے گی اور قرأت کرے گی؟ عقلِ سلیم کیا کہتی ہے؟

دوسرا نکتہ:

حدیث کی تمام معتبر کتابوں (بخاری باب الصلوٰۃ علی الحصیر حدیث نمبر ۳۸، مسلم ج:۱ ص:۲۳۴ وغیرہ) میں ایک واقعہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ بی بی ام سلیم انصاریہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں آپؐ نے نماز پڑھائی تو حضرت انسؓ اور ان کا چھوٹا بھائی، حضور ﷺ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور حضرت ام سلیمؓ اپنے ان دونوں بیٹوں کے پیچھے کھڑی ہوئیں۔ ''صففت انا و الیتیم ورائه و العجوز من ورائنا''۔ (ترمذی ج:۱ ص:۵۵) تو شریعت مطہرہ کی نازک مزاجی اور احتیاط پسندی اس بات کی روادار نہیں ہے کہ بوڑھی ماں اپنے بیٹوں کے ساتھ صف میں کھڑی ہوجائے۔ کیا وہ اس بات کی اجازت دے گی کہ عورت، مردوں کی امام بن کر آگے کھڑی ہو؟ حاشا وکلا۔

تیسرا نکتہ:

شریعت مقدسہ تو یہاں تک حکم دیتی ہے کہ عورت کا گھر کے صحن میں نماز پڑھنے سے، کمرے میں نماز پڑھنا بہتر ہے اور کمرے کے کسی گوشے میں نماز ادا کرنا کھلے کمرے میں ادا کرنے سے بہتر ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

''صلاتها فی مخدعها افضل من صلاتها فی بیتها''

(ابوداؤد شریف ج:۱ ص:۹۱)

شریعت عورت کو یہاں تک حجاب اور پردے میں دیکھنا چاہتی ہے، مگر ڈاکٹر

صاحب اسے محلے کی مسجد میں مردوں کے آگے کھڑا کرنا چاہتے ہیں، فوا عجبا:

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا؟

اب ہم ڈاکٹر صاحب کے ارشادات کا جائزہ لیتے ہیں:

۱.....وہ فرماتے ہیں: ام ورقہؓ کو رسول اللہ ﷺ نے ان کے محلے کی کا امام مأمور فرمایا تھا۔

ہم نے سنن ابی داؤد اور مسند احمد (جن سے روایت لی گئی ہے) کو کھول کر ان کا ایک ایک لفظ بغور پڑھا، مگر ہمیں نہ تو کہیں محلے کا لفظ نظر آیا، نہ مسجد کا۔

۲.....ڈاکٹر صاحب کی یہ تکنیک بڑی بامقصد اور حیرت انگیز ہے کہ پہلے تو وہ ایک مفروضہ کو شک وارتیاب کے انداز میں بیان کرتے ہیں، پھر یک لخت ترقی کر کے وہ اسے یقین کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان کے فرمان کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

> ''ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا۔ ان کا ایک مؤذن تھا، جو ایک مرد تھا۔ اور ان کے غلام بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ غلام ان کی امامت میں نماز پڑھتے ہوں گے۔ غرض یہ کہ امامت صرف عورتوں کے لئے نہیں تھی، بلکہ مردوں کے لئے بھی تھی۔''

(حوالہ اوپر گزر چکا ہے)

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ کس طرح پیشہ ور مناظروں کی طرح ڈاکٹر صاحب نے ''ہوگا'' اور ''ہوں گے'' کو ''تھا۔ تھی'' میں تبدیل کر دیا۔ ایک محقق آدمی، اصحاب الجدل کی روش کیوں اختیار کرتا ہے؟

۳.....شروع میں جو اقتباس دیا گیا ہے، اس میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب، سنن ابی داؤد اور مسند احمد کا حوالہ دینے کے بعد معاً ہی یہ فرماتے ہیں کہ: اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے، حالانکہ ان کتابوں میں ان الفاظ کا کوئی نشان تک نہیں ہے۔ یہ محض اضافہ ہے جو موصوف کی علمی دیانت اور ثقاہت کو مجروح کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اور مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں کہ ان کے غلام بھی تھے۔''

لیکن زیر بحث روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف ایک غلام کا ذکر ہے۔ غلاموں کا نہیں۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب نے اور کہیں سے لیا ہو۔ ہم روایت کے الفاظ مع ترجمہ نقل کر دیتے ہیں۔ قارئین خود پڑھ کر اطمینان فرمالیں:

''قالؒ و کانت قد قرأت القرآن فاستأذنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تتخذ فی دارھا مؤذناً فاذن لھا. قال و کانت دبّرت غلاماً و جاریۃً، فقاما الیھا باللیل، فغمّاھا بقطیفۃٍ لھا، حتّٰی ماتتْ و ذھبا۔''

(سنن ابی داؤد ج:۱ ص:۹۴)

ترجمہ: ''راوی کہتا ہے، ام ورقہ نے قرآن پڑھ رکھا تھا، تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنے گھر میں مؤذن مقرر کرلیں، تو آپؐ نے اسے اجازت دے دی۔ راوی مزید کہتا ہے کہ اس نے ایک غلام اور ایک لونڈی کو مدبّر بنالیا تھا۔ انہوں نے رات کو اٹھ کر اس کی چادر سے اس

کا گلا گھونٹ دیا، حتّٰی کہ وہ مرگئی اور وہ دونوں چلے گئے.....
(آگے حضرت عمرؓ کا انہیں تلاش کروا کے انہیں سزائے موت دینا بھی مذکور ہے)

سنن ابی داؤد کے اسی باب میں دوسری روایت ان الفاظ سے آئی ہے:

"و جعل لها مؤذناً يؤذن لها. و امرها ان تؤمّ اهل دارها۔" (سنن ابی داؤد ج:۱ ص:۹۵)

ترجمہ:....."آپؐ نے ایک مؤذن اس کے لئے مقرر کردیا جو اس کے لئے اذان کہہ دیتا اور اسے اجازت دی کہ اپنے اہل خانہ کی امام بن جایا کرے۔"

اب آپ فرمایئے کہ اوپر کے خط کشیدہ الفاظ (کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے) آپ کو کہیں نظر آتے ہیں؟ جب نہیں ہیں تو ہوا میں محل تعمیر کرنے کی کیا تک بنتی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں روایتوں کے الفاظ "فی دارها".....اور ....."لها" خود یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خاتون گھر میں عورتوں کی جماعت کراتی تھیں اور مؤذن گھر میں اذان کہہ کر چلا جاتا تھا۔ نماز وہاں ادا نہیں کرتا تھا جیسا کہ چند سطور بعد خود حدیث شریف سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی۔

ایک اعجوبہ:

ہماری طرح قارئین کو بھی شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ "دار" کے اصلی معنے "گھر" کے ہیں جو چار دیواری سے گھرا ہوا ہو۔ قرآن پاک میں کم و بیش تیس مرتبہ یہ لفظ آیا ہے۔ دار الآخرۃ۔ دار السلام۔ دار القرار۔ دار الخلد۔ وغیرہ وغیرہ اور ہر جگہ گھر

کے معنے مراد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی توسیع یہ فرمائی کہ دار سے مراد محلّہ لیا۔ پھر اس کے ساتھ مسجد کا لفظ بڑھایا۔ بعد ازاں مستورات کے ساتھ مردوں کو شامل کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی شرعی دلیل کے بغیر یہ توسیع در توسیع کس ضرورت کے پیش نظر فرمائی گئی؟

حقیقت حال، ڈاکٹر صاحب کے تصور کے برعکس:

ڈاکٹر صاحب نے تو ''ہوگا'' اور ''ہوں گے'' کے الفاظ کو ''تھا'' اور ''تھی'' کا لباس پہنا کر ایک رائے قائم فرمالی اور ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان فرمادیا.....لیکن .....اگر وہ کتب حدیث کو مزید کھنگالنے کی زحمت فرماتے تو انہیں اپنی غلطی کا علم ہوجاتا اور پھر ان شکوک اور ظنون کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جاتی۔

سنن دارقطنی میں خود حضرت ام ورقہؓ سے روایت ہے:

''ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذِن لها
اَن يُؤَذَّن لها و يُقَامَ وَ تَؤُمَّ نساء ها.''

(سنن دارقطنی باب ذکر الجماعۃ)

ترجمہ:.....''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اجازت دی تھی کہ اس کے لئے اذان اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنی عورتوں کی امامت کرائے۔''

فرمایئے، مسئلہ حل ہوگیا؟ حضرت ام ورقہؓ کس کی امام بنتی تھیں؟ عورتوں کی یا مردوں کی؟.....راقم السطور کو اپنی علمی کم مائیگی کا اعتراف ہے، پھر کتابی ذخیرہ بالکل

محدود سا ہے۔ ممکن ہے "تؤم نساء ھا" کا جملہ حدیث کی دیگر کتابوں میں بھی منقول ہو، مگر اس وقت تک یہ جملہ معتبر سند کے ساتھ صرف دار قطنی میں ملا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ فقہ و حدیث اس پر متفق ہیں، چنانچہ محدث ابن خزیمہؒ اپنی صحیح میں حدیث ام ورقہ کو نقل کرتے ہوئے عنوان قائم فرماتے ہیں:

"باب امامة المرأة النساء فی الفریضة."

ترجمہ:..... "عورت کا فرض نماز میں عورتوں کی امامت کرانے کا بیان۔" (ص:۸۹ ج:۳)

ہمیں یقین ہے کہ اگر ایسی عبارات، ڈاکٹر صاحب کے سامنے ہوتیں تو وہ علماً امت کے متفق علیہ مسئلہ کے خلاف کوئی رائے قائم نہ فرماتے۔

عورتوں کے لئے مردوں کا امام بننے کی صریح ممانعت:

حضرت ام ورقہؓ کی روایت پر خاصی بحث ہو چکی ہے، اخیر میں ہم نفس مسئلہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ایک فرمان نقل کرتے ہیں جو اس عنوان پر نص صریح کی حیثیت رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"لا تؤمن امرأة رجلا۔" (سنن ابن ماجہ ص:۷۷)

ترجمہ: ہرگز کوئی عورت کسی مرد کی امام نہ بنے۔

اس حدیث کی سند میں مقال ہے، مگر علماً امت کی طرف سے تلقی بالقبول پائی جاتی ہے، چنانچہ حافظ ابن تیمیہ کے جد امجد مجد الدین ابن تیمیہؒ نے اسے مُنتقی الاخبار میں، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے بلوغ المرام میں، نواب صاحب بھوپالیؒ نے

عرف الجادی میں اسے نقل کیا ہے۔

اس فرمان کی رو سے کوئی عورت کسی صورت میں مردوں کی امام نہیں بن سکتی۔ شریعت کا دوٹوک فیصلہ ہے، لہٰذا ''یوں ہوگا، وون ہوگا'' کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

ایک اور حدیث شریف میں بھی رکاوٹ کی واضح دلیل ہے۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا:

''اخروهن حيث اخرهن الله.'' (مشکوٰۃ ص:۴۴۴)

ترجمہ:..... ''تم انہیں پیچھے رکھو کیونکہ اللہ نے انہیں پیچھے رکھا ہے۔''

ارشادِ گرامی کے یہ الفاظ اپنے مطلب میں بالکل واضح ہیں۔ مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

بہت ممکن ہے کہ خواتین کے بارے میں ضرورت سے زیادہ فراخ دلی، ڈاکٹر صاحب میں یورپ کی بودوباش سے آگئی ہو، ورنہ تو ڈاکٹر صاحب ایسی باتیں نہ ارشاد فرماتے، جو حدیث شریف میں نہ تو صراحتاً مذکور ہیں، نہ اس سے مفہوم ہوتی ہیں۔ اگر شریعت میں کوئی حکم عورتوں کے لئے مردوں کی امامت کے جواز کا آجاتا تو ماوشما کو قطعاً اس پر اعتراض کا حق نہ ہوتا۔ یقیناً ائمۂ دین اس کے قائل ہوتے، کتب فقہ میں اس کا ذکر ہوتا اور امت میں اس پر عمل کی مثالیں نظر آتیں، جب کہ کتابوں میں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے، ایک حوالہ آپ بھی پڑھ لیجئے:

''كتاب الفقه على المذاهب الاربعة'' چودھویں صدی ہجری میں لکھی گئی ایک نہایت ہی عمدہ تصنیف ہے۔ جس میں مصنف نے چاروں فقہی مسلک بڑی

وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ علماً اس کو ایک حوالہ کی کتاب مانتے ہیں اور اس پر اعتماد فرماتے ہیں۔ اس کی چند سطروں کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''امامت کی شرطوں میں سے ایک شرط، امام کا مرد ہونا ہے۔ تو عورتوں اور خنثیٰ کا امام بننا اس صورت میں درست نہیں ہے جب کہ مقتدی مرد ہوں۔ اگر مقتدی عورتیں ہوں تو ان کا امام بننے کے لئے مرد ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ عورت، عورت کی امام بن سکتی ہے۔ تین ائمہ (امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ) اس پر متفق ہیں۔ مالکیہ کا اس میں اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں:

.....عورت اور خنثیٰ امام نہیں بن سکتے، نہ مردوں کے لئے نہ عورتوں کے لئے، نہ فرض نماز میں نہ نفل میں.....ان کے نزدیک امام کا مرد ہونا ہر حالت میں شرط ہے۔ مقتدی کوئی بھی ہو۔''

(کتاب الفقہ ج:۱ ص:۳۷۲)

اسلام اور موسیقی

پہلے اس عنوان پر جناب ڈاکٹر صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے:

۱:.....''رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو اس کام (اذان) کے لئے منتخب فرمایا، کیونکہ ان کی آواز سریلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے انہیں اذان کا طریقہ سکھایا اور یہ بھی بتایا کہ کس لفظ کو کھینچو، کس کو مختصر کرو، گویا موسیقی کی سریں، رسول اللہ ﷺ نے انہیں سکھائیں۔''

(خطبات ص:۲۴۱ طبع چہارم)

۲:.....خطبہ ختم ہونے کے بعد سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی نے مذکورہ بالا بیان کا حوالہ دے کر سوال کیا کہ موسیقی کی اسلام میں کس حد تک گنجائش ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں ارشاد فرمایا:

''یہی نہیں، اور بہت سی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کی اسلام میں ممانعت بالکل نہیں ہے۔ اگر ممانعت ہے تو اس بات کی کہ مثلاً نماز کے وقت موسیقی کا شغل جاری رکھا جائے، یا اس کا منشا ایسی تفریح ہو جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بری سمجھی جاتی ہے۔''

(خطبات ص:۲۵۲)

۳:.....اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے موقف کو مثالوں سے واضح کرتے ہوئے آگے چل کر ارشاد فرمایا:

"قرآن مجید کی تلاوت بھی موسیقی ہی کی ایک شاخ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے احکام ہیں کہ قرآن مجید کو معمولی نثری عبارت کی طرح نہ پڑھو بلکہ خوش الحانی سے پڑھو اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ نے کسی غنا، کسی گانے کی اجازت اتنی نہیں دی ہے جتنی قرآن کو اچھی آواز سے تلاوت کرنے کی۔" (ص:۲۵۳۔۲۵۴)

۴:.....خطبہ نمبر ۹ کے سلسلۂ سوال جواب میں کسی نے ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا کہ پچھلے کسی لیکچر میں موسیقی کے بارے میں فرمایا کہ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔ کیا ساز کی بھی اجازت ہے۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں آلات مزامیر کو توڑنے کے لئے آیا ہوں۔ اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے یوں دیا:

"آپ مجھے اس حدیث کا حوالہ دیں۔ اگر حدیث صحیح ہوئی تو میں قبول کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہوں۔ باقی رہے ساز، تو میری موسیقی دانی کا یہ عالم ہے کہ مجھے علم نہیں کہ ساز کسے کہتے ہیں؟" (خطبات ص:۳۱۷)

۵:.....خطبہ نمبر ۱۲ کے سلسلہ میں سوال جواب کے دوران کسی صاحب نے پھر کہہ دیا کہ یہ بتایا گیا ہے کہ مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث ہے جس میں کم وبیش یہ الفاظ ہیں کہ خدا نے مجھ کو معازف اور مزامیر کے نابود کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"جس طرح ہم حدیث پر عمل کرنے کے پابند ہیں..... اسی طرح اس بارے میں اولاً یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا یہ روایت صحیح بھی ہے یا نہیں..... اس تحقیق کے

ختم ہونے تک، جس کا مجھے یہاں وقت نہیں مل سکتا کوئی رائے اس مسئلے کے متعلق قائم نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال حدیث کے تمام الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ بتوں کی پوجا اور پرستش کے لئے گانا بجانا ہوتا ہے، میں اس کو محو کرنے کے لئے آیا ہوں۔''

محترم قارئین! موسیقی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے ارشادات آپ نے ملاحظہ فرمالئے۔ یہ اقتباسات ان کے خطبات کے مختلف مقامات سے لئے گئے ہیں اور بصد افسوس کہنا پڑ رہا ہے کہ نہ صرف یہ کہ زیر نظر موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی معلومات ناقص ہیں، بلکہ گستاخی معاف! ان کے بیان میں علمی دیانت بھی مجروح ہوتی نظر آتی ہے۔ ہم ان اقتباسات کا نمبروار تجزیہ کرتے ہیں اور اگر کہیں ہمارے لب ولہجہ میں تلخی وترشی محسوس ہو تو ہم پیشگی معذرت خواہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی بزرگی کا احترام بجا، مگر اللہ کا دین کہیں زیادہ احترام کا مستحق ہے۔ آخر علم کی حمایت اور دین کا تحفظ، اخلاف کی ذمہ داری ہے۔

۱:.....اسلام میں اذان کا سلسلہ کیونکر جاری ہوا؟ اس کی تفصیل کتب حدیث میں سے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی میں آئی ہے۔ باقاعدہ اذان شروع ہونے سے پہلے ایک روز صحابہ کرام میں مشورہ ہوا کہ لوگوں کو نماز کے لئے کیونکر جمع کیا جائے؟ مختلف تجویزیں سامنے آئیں، مگر کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ اس وقت تک حضرت بلالؓ باآواز بلند کہہ دیا کرتے تھے: ''الصلوٰۃ جامعۃ'' اور لوگ نماز کے لئے جمع ہوجاتے تھے۔ اس دوران ایک انصاری صحابی، حضرت عبداللہ بن زیدؓ، نے رات کو ایک خواب دیکھا جس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ انہیں اذان کے معروف کلمات تلقین کئے گئے۔ صبح کی نماز سے پہلے

انہوں نے کاشانۂ نبوت پر حاضر ہوکر اپنا خواب عرض کیا۔ ادھر وحی الٰہی سے اس رؤیائے صادقہ کی تصدیق ہوگئی۔ تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہؓ سے فرمایا:

"انها لرؤيا حق أن شاء الله، فقم مع بلال فالق عليه ما رأيت، فليؤذن به فانه اندیٰ صوتاً منک."

(سنن ابی داؤد ج:۱ ص:۷۹)

ترجمہ:..... "یہ خواب انشاءاللہ، سچا ہے۔ تم بلال کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ، تم نے جو کچھ دیکھا ہے، اسے بتاتے جاؤ، وہ اسے کہتا جائے کیونکہ وہ تم سے بلند آواز ہے۔"

چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں بلالؓ کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ میں یہ کلمات انہیں بتاتا رہا اور وہ پکار کر انہیں دہراتے رہے۔ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی چادر کو گھسیٹتے ہوئے پہنچ گئے اور انہوں نے بھی اپنا اس طرح کا خواب بیان کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فللّٰہ الحمد۔

یہ تفصیل مندرجہ بالا چاروں کتابوں میں موجود ہے اور ان میں سے کسی ایک میں یا ان کے علاوہ کسی اور کتاب میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت بلالؓ کا انتخاب سریلی آواز کی وجہ سے کیا گیا تھا، بلکہ اس بات کی تصریح ہے کہ وہ بلند آواز ہیں، اس لئے ان کا تقرر بطور مؤذن ہوا۔ دوسرا یہ کہیں مذکور نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان کے سر بتائے تھے۔ بلکہ روایت میں تصریح ہے: "فجعلت القيه عليه" یعنی حضرت عبداللہؓ خود ہی کہلواتے رہے۔

اب پڑھئے اوپر دئے گئے اقتباس نمبر ایک کی عبارت اور اندازہ لگائیے کہ ڈاکٹر صاحب کا بیان حقیقت سے کتنا دور ہے!

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہئے!

۲:.....اب آپ اقتباس نمبر دو کی طرف آیئے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس فرمان نے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے کہ:

''موسیقی کی اسلام میں ممانعت بالکل نہیں ہے''

حیرت اس بات پر ہے کہ ایک فاضل آدمی اتنی بڑی جسارت کیونکر کرسکتا ہے کہ وہ ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال قرار دیتا ہے۔ اس مسئلہ پر نئی اور پرانی بہت سی کتابیں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ ہم قارئین کو مشورہ دیں گے کہ اگر وہ ضرورت سمجھتے ہوں تو درج ذیل دو کتابچوں کا مطالعہ فرمائیں:

۱:.....اسلام اور موسیقی.....از حضرت مفتی محمد شفیعؒ (صاحب تفسیر معارف القرآن)۔

۲:.....مسائل سماع.....از فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں (بانی بریلوی مکتب فکر)۔

ہمارے لئے اس وقت تفصیل میں جانا ممکن نہیں ہے۔ مختصراً چند معروضات سنئے:

موسیقی کے لفظی معنے ہیں، مخصوص قواعد کے تحت گانا بجانا۔ اسی کے لئے عربی زبان میں غناءٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بنی نوع انسان میں جہاں دوسری برائیاں رائج چلی آرہی ہیں، وہاں موسیقی بھی ایک ایسی برائی ہے جو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے جڑ پکڑ چکی ہے۔ اس فن کے ماہرین نے چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں چھوڑیں۔ جہاں تک شریعت مقدسہ کا تعلق ہے، وہ انسان کو نیکی کی راہ پر چلاتی اور بدی سے دور رکھتی ہے۔ اب توجہ سے سنئے کہ موسیقی کے بارے میں وہ کیا ہدایات دیتی ہے۔

(ا) یہ عالم ہست و بود، متضاد اشیاءٌ سے مرکب ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: رات اور دن، گرمی اور سردی، نور اور ظلمت، نیکی اور بدی..... وغیرہ وغیرہ۔ اب

اگر کوئی آدمی پوچھے کہ قرآن اور قرآنی تعلیمات کا متضاد کیا ہے تو اس کا جواب ہماری زبان سے نہیں، خود قرآن سے سنئے:

کھولئے پارہ نمبر ۲۱، سورۂ لقمان۔ بسم اللہ سے پڑھنا شروع کیجئے۔ آغاز میں فرمایا گیا ہے:

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ. هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَ (سورۂ لقمان:۲،۳)

جس سے معلوم ہوا:

۱:.....قرآن کریم، علم و دانش کا گنجینہ ہے۔

۲:.....یہ ہدایت کا نصاب کامل ہے، جس کے ہوتے ہوئے نہ تو عقل کی بھول بھلیوں میں جانے کی ضرورت ہے، نہ دائیں بائیں جھانکنے کی ضرورت۔

۳:.....یہ سراپا رحمت ہے۔ اس کے بعد اور کیا چاہئے؟ پس سب کچھ ہی تو مل گیا۔

۴:.....یہ نعمت کن لوگوں کا نصیب ہے؟ ان کا جن کے دل نیک جذبات سے بھرپور ہیں، جن کے خیالات پاک، اعمال پاک، گویا نیکوکاری ان کی فطرت اور جبلت بن چکی ہے۔

۵:.....آگے ان کے چند اوصاف کا ذکر فرمایا کہ وہ اللہ سے لو لگانے والے اور اپنی ہاتھ کی کمائی کو راہ مولیٰ میں خرچ کرنے والے ہیں۔ ان کی نگاہ دنیا کے سود و زیاں پر نہیں ہوتی۔ آخرت ان کا مطمح نظر ہوتی ہے۔

۶:.....وہ دنیا میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، تو راہ حق پر گامزن ہوتے ہیں اور آخرت میں فوز و فلاح ان کا مقدر ہوگا۔

محسنین یعنی قرآن کریم کے پیروکاروں کے ذکر کے بعد آیت نمبر ۶ اور ۷ میں ان کے مقابل گروہ کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو لھو الحدیث کے دل دادہ

ہیں۔ وہ خود گمراہ اور دوسروں کے گمراہ کرنے والے ہیں۔ اللہ کے دین کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ ایسے لوگ رسوا کن عذاب کے مستحق ہے۔

~~اس کے بالمقابل ہے "لھو الحدیث"~~ :

"لھو الحدیث" سے کیا مراد ہے؟ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے تین مرتبہ قسم کھا کر فرمایا: اس سے مراد ہے راگ باجا۔ یہی تفسیر اور کئی اَجلّہ صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت ابوھریرہؓ، حضرت جابرؓ اور کئی ایک تابعین سے منقول ہے۔ دیکھئے تفسیر ابن کثیر، مدارک اور بغوی وغیرہ۔ جب راگ باجا، قرآن پاک کے مقابل ٹھہرا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سراسر گمراہی، اللہ کی رحمت سے دوری کا سبب اور بدکاروں کا حصہ ہے۔

(ب) شیطانی آواز: قرآن کریم کی سورۂ اسرا آیت: ۶۲ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب شیطان، اپنی سرکشی کی وجہ سے بارگاہ خداوندی سے مردود ہوا تو اس نے پھر اللہ تعالیٰ سے کہا کہ میں اولاد آدم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب کو اپنے دام میں کرلوں گا۔ ادھر سے ارشاد ہوا: جا مردود! جو تیرے پیروکار ہوں گے، میں تیرے سمیت انہیں جہنم میں ڈالوں گا۔ اور ان میں سے جس جس پر تیرا بس چلے، تو اپنی آواز کے ذریعے اس کو ورغلا لے اور اپنی سوار اور پیادہ فوج کو ان پر چڑھالا، ان کے اموال و اولاد میں حصہ دار بن جا اور انہیں جھوٹے وعدوں کے ذریعے بہلالے۔

اب سوال یہ ہے کہ: "واستفزز من استطعت منھم بصوتک" (بنی اسرائیل: ۶۴) میں "بصوتک" یعنی شیطانی آواز سے کیا مراد ہے؟ تو پاک و ہند کے علاوہ دیگر بلاد اسلامیہ میں بھی پڑھائی جانے والی تفسیر جلالین میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"بدعائک بالغناء و المزامیر و کل داع الی المعصیۃ۔"

ترجمہ:..... ''راگ اور باجوں کے ذریعہ تیرا ان کو بلانا،
اور ہر وہ چیز جو (اللہ کی) نافرمانی کی طرف بلانے والی ہو۔''

تفسیر بغوی اور ابن کثیر وغیرہ میں مجاہد تابعیؒ کا تفسیری قول نقل کیا گیا ہے :
''بالغناء و المزامیر''۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ کا قرآن راگ باجے کو ''لھو الحدیث'' اور شیطان کی آواز قرار دیتا ہے، مگر قرآن پر ایمان رکھنے والے کچھ لوگ ان چیزوں کو جائز قرار دیتے ہیں۔

شریعت مقدسہ کا دوسرا سرچشمہ ہے حدیث شریف۔ اب ہم اس کی طرف آتے ہیں کہ حدیث شریف کی رُو سے موسیقی کا کیا حکم ہے؟ توجہ فرمائیے :

پہلی حدیث : رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لیشربن ناس من امتی الخمر یسمونھا بغیر اسمھا یعزف علیٰ رؤسھم بالمعازف و القینات یخسف اللہ بھم الارض و یجعل منھم القردۃ و الخنازیر۔''

(جامع صغیر ج:۲ ص:۱۳۹ بحوالہ ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، طبرانی و بیہقی)

ترجمہ:..... '' میری امت کے کچھ لوگ شراب کا نام بدل کر اسے پئیں گے۔ ان کے سروں پر باجے بجائیں گے۔ گانے والی عورتیں موجود رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کچھ کو زمین میں دھنسا دے گا اور کچھ کی شکلیں بگاڑ کر انہیں بندر اور سور بنا دے گا۔''

الفاظ کے کچھ تفاوت کے ساتھ یہی روایت بخاری شریف میں بھی آئی ہے۔

اس کے الفاظ یہ ہیں:

"لیکونن من امتی اقوام یستحلون الحر و الحریر و الخمر و المعازف." (بخاری ص:۸۳۷)

ترجمہ:..."ضرور میری امت میں کچھ لوگ ہوں گے جو بدکاری، ریشم، شراب اور باجوں کو حلال سمجھیں گے۔"

آگے پھر اس روایت میں بھی خسف اور مسخ کا ذکر آیا ہے۔

قارئین غور فرمائیں کہ "حلال سمجھیں گے" کا لفظ کیا بتا رہا ہے اور پھر اس مختصر سی فہرست پر بھی غور کریں، زناکاری، مردوں کا ریشم پہننا، شراب پینا کس درجہ کے قبیح جرائم ہیں۔ ان کے ساتھ "باجے بجانے" کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ باجے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو منہ سے بجائے جاتے ہیں ان کے لئے مزامیر کا لفظ آتا ہے یہ جمع ہے مزمار کی۔ مثال کے طور پر بانسری، شہنائی، الغوزہ، مرلی وغیرہ۔ دوسرے وہ جو ہاتھ سے بجائے جاتے ہیں ان کے لئے عربی زبان میں معازف کا لفظ آتا ہے مثلاً سارنگی، بربط، طبلہ، نقارہ وغیرہ۔

شرعی حکم دونوں کا یکساں ہے۔ احادیث میں کہیں معازف کا لفظ آیا ہے، کہیں مزامیر کا اور کہیں دونوں کا۔

دوسری حدیث: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان الله حرم علی الخمر و المیسر و الکوبة."

(سنن ابی داؤد کتاب الاشربہ باب حدیث وفد عبدالقیس)

ترجمہ:..... "اللہ تعالیٰ نے مجھ پر حرام فرمادیا ہے شراب، جوئے اور باجے (طبلے) کو۔"

اس کے ہم مطلب روایت اسی ابو داؤد شریف میں ایک صفحہ پہلے نقل ہوئی ہے جس کا ترجمہ یوں ہے:

"حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے شراب، جوئے، طبلے اور طنبور سے رکاوٹ فرمائی۔"

تیسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان الله بعثنی رحمة للعالمین و هدیً للعلمین و امرنی ربی عز و جل بمحق المعازف و المزامیر و الاوثان و الصلب و امر الجاهلیة."

(مسند احمد مبوب ج:۱۷ ص:۲۳۲)

ترجمہ:..... "اللہ تعالیٰ نے مجھے جہان والوں کے لئے رحمت اور ہدایت کا سرچشمہ بنا کر بھیجا ہے اور میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمام باجوں، بتوں، صلیبوں اور زمانۂ کفر کی رسوم کو مٹادوں۔"

یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں بھی موجود ہے۔

اس کے ساتھ کی ایک روایت فردوس دیلمی کے حوالہ سے کنوز الحقائق میں

موجود ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں:

"امرت بهدم الطبل و المزمار۔" (مجھے طبلہ اور بانسری یعنی ہاتھ اور منہ سے بجانے والے تمام باجوں کے نیست و نابود کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔)"

(کنوز الحقائق بر حاشیہ جامع صغیر ص:۵۳)

متعدد روایات اور بھی اس سے ملتے جلتے مضمون کی مختصر کنز العمال میں موجود ہیں۔

چوتھی حدیث: حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"صوتان ملعونان فی الدنیا و الأخرة مزمار عند نعمة و رنة عند مصیبة."

(جامع صغیر از علامہ سیوطیؒ مع رمز صحیح)

ترجمہ:....." دو آوازیں دنیا و آخرت میں لعنتی ہیں۔ خوشی کے وقت باجے کی آواز اور مصیبت کے وقت ماتم کی آواز۔"

پانچویں حدیث: کتب حدیث میں متعدد صحابۂ کرامؓ سے اس مضمون کی روایت منقول ہے کہ جب امت میں مختلف برائیاں عام ہو جائیں گی، تو اس وقت امت میں خسف (یعنی زمین میں دھنس جانا) مسخ (یعنی شکل بگڑ جانا) قذف (یعنی سنگ باری ہونا) کے عذاب آئیں گے۔ ہم یہاں پر صرف ایک روایت، جو نسبتاً مختصر ہے، نقل کر دیتے ہیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

میری امت میں یہ تینوں عذاب آئیں گے۔ مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کب ایسا ہوگا؟ فرمایا:

"اذا ظهرت القيان و المعازف و شربت الخمور." (ترمذی ج:۲ ص:۴۴)

ترجمہ:..... "جب گانے والی عورتیں اور باجے پھیل جائیں گے اور شرابیں پی جائیں گی۔"

حضرت علی المرتضیٰؓ اور حضرت ابوھریرہؓ کی روایتیں اسی ترمذی میں موجود ہیں۔ حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت ابن ماجہ میں آئی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ابن ابی الدنیا سے جامع صغیر میں آئی ہے۔ پیچھے حضرت ابو مالک اشعریؓ کی حدیث نمبر ایک بھی آچکی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی اس طرح کی روایات منقول ہیں۔

ان تمام روایات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ راگ باجے قطعی طور پر حرام ہیں۔

اقوال بزرگاں:

مسئلہ زیر بحث کے بارے میں اگر ائمۂ دین اور علماً امت کے اقوال جمع کئے جائیں تو بلا شبہ ایک ضخیم دفتر تیار ہوجائے گا جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے، اس لئے ہم کتب فقہ کی عبارات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہاں حضرات صوفیاً کرام کے دو چار اقوال نقل کئے دیتے ہیں۔

بعض لوگ دو غلط فہمیوں کا شکار ہیں، ایک تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ موسیقی کے

بارے میں فقہاً تو تشدد برتتے ہیں، مگر صوفیاً کرام اس بارے میں بہت نرم واقع ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دیوبندی مکتب فکر کے علماً تو سختی دکھاتے ہیں، مگر بریلوی مکتب فکر کے بزرگان نرمی دکھاتے ہیں۔ یہ دونوں خیال قطعی غلط اور خلاف واقعہ ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سطور میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کے خلیفۂ اجل حضرت ابوعلی رودباریؒ، جن کے بارے میں تصوف کے امام شیخ ابو القاسم قشیریؒ فرماتے ہیں: ''**ھو اعلمھم بالطریقة**''۔ کہ وہ طریقت کے سب سے بڑے عالم تھے، ان سے پوچھا گیا کہ ایک شخص مزامیر سنتا ہے اور کہتا ہے یہ میرے لئے حلال ہیں اس لئے کہ میں ایسے درجے تک پہنچ گیا ہوں کہ احوال کے اختلاف کا مجھ پر اثر نہیں ہوتا۔ فرمایا: ''**نعم قد وصل و لکن الی سقر**''۔ ہاں پہنچا تو ضرور مگر جہنم تک (العیاذ باللہ)۔ (رسالہ قشیریہ ص:۳۴)

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے بھی یہ حوالہ اپنے رسالہ مقال العرفاء ص:۳۰ میں نقل کیا ہے.....

فاضل بریلوی، ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

> ''خالی قوالی جائز ہے۔ اور مزامیر حرام..... حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوائد الفواد شریف میں فرماتے ہیں: ''مزامیر حرام است'' حضرت مخدوم شرف الملّہ والدین یحییٰ منیری قدس سرہٗ نے مزامیر کو زنا کے ساتھ شمار کیا ہے۔'' (رسالہ احکام شریعت ص:۱۶۱)

سیرُ الاَولیاً، جو حضرت شیخ نظام الدین اولیاً دہلویؒ کے خلیفہ مولانا محمد بن

مبارک علویؒ کی تالیف (بزبان فارسی) ہے، اس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"ایک صاحب نے حضرت سلطان المشائخ" کی خدمت میں عرض کیا کہ بعض آستانہ دار درویشوں نے ان دنوں ایک ایسے مجمع میں جس میں چنگ، رباب اور مزامیر تھے، رقص کیا۔ فرمایا: انہوں نے ٹھیک نہیں کیا۔ جو چیز نامشروع ہے، وہ ناپسندیدہ ہے۔ اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا کہ میں نے رکاوٹ کی ہے کہ مزامیر اور دوسرے محرمات (ناجائز آلات) درمیان میں نہیں ہونے چاہئیں۔"

(مسائل سماع ص:۶۔۷)

فاضل بریلوی آگے چل کر سیرُ الاولیاؔ ہی کے حوالہ سے حکایت بالا کا تتمہ یوں نقل کرتے ہیں:

ترجمہ:....."اس کے بعد ایک صاحب نے ان کا یہ عذر گزارش کیا کہ جب وہ طائفہ صوفیہ اس جگہ سے باہر آیا، لوگوں نے ان سے کہا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ ایسے مجمع میں جہاں مزامیر تھے، تم نے سماع کیسے سنا؟ اور کیوں کر رقص کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ سماع میں ایسے مستغرق تھے کہ ہمیں خبر ہی نہیں تھی کہ یہاں مزامیر ہیں یا نہیں۔ حضور سلطان المشائخ نے ارشاد فرمایا: یہ جواب بھی کچھ نہیں۔ یہ عذرِ باطل تو تمام معصیتوں پر ہوسکتا ہے۔"

فاضل بریلوی نے یہ جواب نقل کر کے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے:

''یعنی آدمی شراب پئے اور کہہ دے، مجھے خبر ہی نہ تھی کہ یہ شراب ہے یا شربت۔ ماں کے ساتھ زنا کرے اور کہہ دے میں تو ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ یہ معلوم ہی نہ کرسکا کہ یہ ماں ہے یا بیوی۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم''۔

(مسائل سماع ص: ۲۷و۲۸)

آخر میں فاضل بریلوی کے اسی رسالہ ''مسائل سماع'' سے ایک اقتباس اور پڑھ لیجئے:

''فقیر غفرلہ المولیٰ القدیر نے اپنے فتاویٰ میں ثابت کیا ہے کہ ان پیروان ہوائے نفس کا حضرات اکابر چشت قدست اسرارھم کی طرف سماع مزامیر کی نسبت کرنا محض دروغ بے فروغ ہے۔ اون کے اعاظم اجلّہ تصریح فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے مشائخ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر افترا ہے۔..... بعض جہال بدمست، یا نیم ملاّ ہوس پرست، یا جھوٹے صوفی بدست، جو احادیث صحیحہ مرفوعہ محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصّے یا محتمل واقعے یا متشابہ کلمے پیش کرتے ہیں، انہیں اتنی عقل نہیں..... یا قصداً بے عقل بنتے ہیں..... کہ صحیح کے مقابل ضعیف، متعیّن کے آگے محتمل، محکم کے سامنے متشابہ واجب الترک ہے۔ پھر کہاں قول، کہاں حکایت فعل؟ کجا محرم، کجا مبیح؟ ہر طرح یہی واجب العمل، اسی کو ترجیح..... مگر ہوس پرستی کا علاج کس کے پاس ہے؟ کاش! گناہ کرتے اور گناہ جانتے۔ یہ ڈھٹائی اور بھی سخت ہے کہ ہوس بھی

پالیں اور الزام بھی ٹالیں۔ اپنے لئے حرام کو حلال بنالیں۔"

(رسالہ مذکور ص:۷۔۸)

اقتباس نمبر۳

ڈاکٹر صاحب نے بڑا غضب ڈھایا ہے یہ فرما کر کہ قرآن مجید کی تلاوت موسیقی ہی کی ایک شاخ ہے۔ سبحنک هذا بهتان عظيم۔ ہم اس سلسلہ میں ایک حدیث شریف اور پھر اس کی تشریح ایک ایسے محدث کے الفاظ میں نقل کریں گے جو فقط محدث ہی نہیں تھے بلکہ بلند پایہ صوفی بھی تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اقرء وا القرآن بلحون العرب و اصواتها. و اياكم و لحون اهل العشق و لحون اهل الكتابين. و سيجئ بعدى قوم يرجعون بالقرآن ترجيع الغناء و النوح ، لا يجاوز حناجرهم مفتونة قلوبهم و قلوب الذين يعجبهم شانهم." رواه البيهقى و رزينّ."

(مشکوٰۃ المصابیح ص:۱۹۱)

ترجمہ:..... "تم قرآن کو عربوں کے لہجوں اور آوازوں میں پڑھا کرو اور عشق مزاج لوگوں اور تورات، انجیل والوں کے لب ولہجہ سے بچ کر رہو۔ میرے بعد وہ لوگ آئیں گے جو راگ اور بین کے انداز میں زبان کو پھیر پھیر کر قرآن کو پڑھیں گے۔ قرآن ان کے گلوں سے آگے نہیں جائے گا۔ ان کے دل بھی فتنے میں پڑے ہوئے ہوں گے اور ان لوگوں کے دل بھی جنہیں ان

کی یہ ادا پسند آتی ہوگی۔"

اب اس کی مختصر تشریح حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی زبانی سنئے۔ یہ وہ محدث کبیر ہیں جن کے فیضان سے گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں برصغیر کی تاریک فضا میں علم حدیث کا نور پھیلا۔ وہ فرماتے ہیں:

"مراد بلحون عرب تحسین صوت وتطریب اوست بے تکلف در رعایت قوانین موسیقیہ باعانت طبیعت..... ومراد بلحون اہل عشق، آنچہ مے کنند مردم در مغازلہ نساء ومحادثہ ایشاں در اشعار از رعایت قواعد موسیقی وتکلف دراں۔"

(اشعۃ اللمعات شرح فارسی مشکوٰۃ ج:۲ ص:۱۵۵)

ترجمہ:..... "عربوں کے لہجوں سے مراد یہ ہے کہ قوانین موسیقی کا لحاظ کئے بغیر محض اپنی طبیعت کی امداد سے آواز کو بنا سنوار کر پڑھا جائے..... اور اہل عشق کے لہجوں سے مراد وہ انداز ہے جو لوگ غزل خوانی کرتے ہوئے اور عورتوں سے بات چیت کرتے ہوئے قواعد موسیقی کا لحاظ کرتے ہوئے تکلف کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔"

حاصل اس حدیث اور اس کی تشریح کا یہ ہے کہ سادہ، فطری خوش آوازی کے ساتھ قرآن پاک کا پڑھنا اور قواعد موسیقی کے تحت تلاوت کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ پہلی کا حکم دیا گیا ہے اور متعدد روایات میں اس کا حکم آیا ہے۔ دوسری ممنوع ہے، اس سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ اب جو شخص اس فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے کھینچ تان

کر تلاوتِ قرآن مجید کو موسیقی کی شاخ بتاتا ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حق سے اتنا دور کیوں چلا گیا؟

اقتباس نمبر۴ :

ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد فرمانا کہ ''مجھے علم نہیں کہ ساز کسے کہتے ہیں؟'' تعجب خیز ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے۔ اب اگر یہ حقیقت ہے تو انہیں اس مسئلہ میں رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، اور اگر یہ غلط ہے تو انہیں گلو خلاصی کے لئے یہ انداز اختیار کرنا زیب نہیں دیتا تھا۔ بہرصورت ہم مزید اس عنوان پر کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اقتباس نمبر۵ :

ڈاکٹر صاحب سے ایک حدیث کا حوالہ دے کر سوال کیا گیا تو اولاً انہوں نے حدیث کی صحت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی۔ ثانیاً انہوں نے تحقیق کا موقع نہ مل سکنے کا عذر پیش کیا۔ ثالثاً انہوں نے ایک من گھڑت تاویل سے کام چلانے کی سعی فرمائی۔ ہمیں تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بالکل وہی روش اختیار کی جو ایک پہلوان اکھاڑہ جیتنے کے لئے اختیار کرتا ہے کہ کسی نہ کسی پینترے سے میدان سر کرنا ہے۔ اوپر اقتباس نمبر۵ میں جو خط کشیدہ جملہ ہے، اس کو دوبارہ پڑھ لیجئے۔ اس سوال کے جواب میں جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ وہ حدیث ہے جو ہم نے حرمت موسیقی کے دلائل دیتے ہوئے ''تیسری حدیث'' کے عنوان سے نقل کی ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے میرے رب نے چار چیزوں کے مٹانے کا حکم دیا ہے: (۱) موسیقی کے آلات یعنی باجے (۲) بت (۳) صلیب (۴) رسوم جاہلیت..... یہ فرمان

بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ یہ ارشاد خداوندی ہے:

"اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ." (سورۃ المائدہ:۹۰)

ترجمہ: "بے شک شراب، جوا، بت اور فال نکالنے کے تیر، گندگی اور شیطانی کام ہیں تو تم ان سے بچ کر رہو۔"

اب کوئی جاہل ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ شراب وہ حرام ہے جو بت پرستی کے وقت پی جائے، جوا وہ حرام ہے جو بتوں کی پرستش کے وقت کھیلا جائے۔ یہ چاروں کام بیک وقت کئے جائیں تو حرام اور ناجائز ہیں، ورنہ تو نہیں۔ اگر کوئی شخص بدرستی ہوش وحواس یہ بات منہ سے نہیں نکال سکتا تو دنیا کی کون سی منطق اس بات کو درست قرار دے سکتی ہے کہ حدیث بالا میں ذکر فرمودہ چاروں کام اکٹھے کئے جائیں تو ممنوع اور حرام ہیں، ورنہ تو نہیں؟

نماز میں سر کا ڈھانپنا

خطبہ نمبر ۱۰ کے بعد جو سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو اس دوران ایک سوال یہ پوچھا گیا تھا کہ نماز میں سر پر کپڑا لینا ضروری ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جناب ڈاکٹر صاحب نے مردوں اور عورتوں کا حکم الگ الگ بیان فرمایا۔ جہاں تک فقہی لحاظ سے جواب کا تعلق ہے، تو انہوں نے درست ارشاد فرمایا، مگر ہم چند اور نکات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

"مرد کے متعلق سر ڈھانپنا ضروری نہیں ہے..... کپڑے پہنے تو بہت اچھا ہے، نہ پہنے تو کسی کو کافر کہنے کا حق نہیں ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ صحیح بخاری میں آیا ہے۔ ایک صحابی تھے غالباً سعد بن معاذ یا کوئی اور، نام اس وقت یاد نہیں۔ ان کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بہت بعد، خلافت کے زمانے میں ایک دن ان کو کچھ لوگوں نے بہت ادب سے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہی نماز پڑھایئے، ہم آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً اس سے پہلے اسی قسم کی گفتگو ہوئی تھی۔ بہرحال ان صحابی نے نماز پڑھانا قبول کیا۔ نماز سے قبل انہوں نے سجادہ کی طرف جاتے ہوئے پہلے عمامہ اتارا پھر کوٹ اتار پھینکا اور پھر قمیص بھی اتار دی۔ صرف تہ بند کے ساتھ آگے آئے اور آگے بڑھ کر نماز شروع کی۔ لوگ حیران ہوئے۔ اس پر انہوں نے جو

کچھ فرمایا وہ بخاری میں ان الفاظ میں آیا ہے کہ: ''تجھ جیسے احمق کو بتانے کے لئے میں نے عمداً ایسا کیا ہے۔ کیا حضور ﷺ کے زمانے میں تمہارے خیال میں ہمارے پاس دو دو کپڑے ہوتے تھے؟ اس وقت ہم ننگے سر ہی نماز پڑھتے تھے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر ڈھانپنا بے شک اچھا ہے، ادب کا تقاضا ہے۔ اور اس آیت شریف کے مطابق ہے کہ جب نماز کے لئے جاؤ تو زینت کے ساتھ جاؤ۔ لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ یہ واجب ہے۔'' (خطبات ص:۳۲۴)

اب ہماری چند گزارشات سنئے:

۱:..... سوال سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سائل نے کسی کی گستاخی کا ارتکاب کیا تھا، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب میں اس قدر ہلکا پن کہاں آگیا کہ ان کے منہ سے ایک ایسا جملہ نکلا جو ان کی بزرگ عمری اور علمی سنجیدگی کو زیب نہیں دیتا۔ کس نابکار نے کبھی یہ کہا ہے کہ جو شخص نماز میں سر نہ ڈھانپے، وہ کافر ہوجاتا ہے؟ آخر اس ''طنز شریف'' کا مقصد اور موجب کیا ہے؟

۲:..... ڈاکٹر صاحب میں جو ہیجانی کیفیت نظر آرہی ہے، غالباً اسی کا اثر ہے کہ وہ صاحب واقعہ صحابی کا نام بھول گئے۔ انہیں یاد نہ رہا، مگر تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ حضرت سعد بن معاذؓ تو ۵ھ میں غزوۂ خندق میں زخمی ہوکر اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ان کی وفات پر اللہ کا عرش ہل گیا ہے، جب کہ مذکورۃ الصدر واقعہ عہد نبوت کے بعد کا ہے۔

قارئین کی اطلاع کے لئے ہم عرض کئے دیتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت جابرؓ کا ہے

۳:.....ڈاکٹر صاحب نے دعوت کا تذکرہ کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی وہ بخاری شریف سے نقل کر رہے ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں اس بات کا صریحاً تذکرہ تو کجا، کہیں اشارہ تک اس طرف نہیں پایا جاتا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے کہاں سے لیا ہے۔

۴:.....اوپر نقل کی گئی عبارت میں چوتھا خط کشیدہ اقتباس پھر پڑھئے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے الفاظ کی عجیب وغریب ملمع سازی فرمائی ہے۔ روایت میں کہیں بھی اس قسم کے الفاظ موجود نہیں ہیں، بلکہ قارئین کو سن کر حیرت ہوگی کہ بخاری کی روایت میں صرف ایک رداً (اوڑھنے کی چادر) کا تذکرہ ہے۔ حضرت جابرؓ کا یہ واقعہ بخاری کی کتاب الصلوٰۃ میں دو مرتبہ آیا ہے۔ باب نمبر۳ میں اور باب نمبر۱۱ میں۔ باب نمبر۱۱ کا عنوان ہے: ''الصلوٰۃ بغیر رداء'' اور نیچے روایت میں وردادہ موضوع (یعنی ان کی اوپر کی چادر رکھی رہی) کے کلمات درج ہیں۔

محدثین حضرات کی احتیاط کا تو یہ عالم ہے کہ اگر انہیں کسی روایت کے الفاظ میں کہیں شک پیدا ہوگیا تو انہوں نے اپنا شک بیان کر دیا۔ مثال کے طور پر وضو کی فضیلت میں مسلم شریف (ج:۱ ص:۱۲۵) میں ایک روایت آئی ہے، اس میں ایک جگہ تو آیا ہے: ''العبد المسلم او المؤمن'' راوی کو تردد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان میں المسلم کا لفظ ہے یا المؤمن کا۔ اسی حدیث میں آگے ہے: ''مع الماء او مع اٰخر قطر الماء'' یہاں بھی راوی نے تردد اور شک کا اظہار کیا ہے۔ پھر مسلسل آگے کتابوں میں جہاں بھی یہ روایت نقل کی گئی، اسی طرح کی گئی..... ایک طرف ان حضرات کی یہ احتیاط اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کے اضافے۔ مقام حیرت ہے۔ رداً کو عمامہ، کوٹ اور قمیص میں تبدیل فرمادیا۔

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

خطبات بہاول پور میں چھٹا خطبہ ''دین (عقائد، عبادات وتصوف)'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں جب سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی نے یہ سوال کیا:

''ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اگر سائنسی نقطۂ نظر سے صحیح ہے تو اسلام اور سائنس میں تضاد ہے۔ آپ اس تضاد کو حل کرنے کے بارے میں ارشاد فرمائیں۔''

ڈاکٹر صاحب کا جواب ڈیڑھ صفحے تک چلا گیا ہے۔ پوری عبارت کا نقل کرنا غیر ضروری ہے۔ چند اقتباسات ہم یہاں نقل کرتے ہیں اور پھر ان کے بارے میں اپنی طرف سے چند معروضات پیش کریں گے۔

۱:..... ''یہ پہلے ہی فرض کرلیا گیا ہے کہ ڈارون کے نظریے کو اسلام نے رد کردیا ہے۔ اس کو ثابت کرنا آپ پر واجب ہے۔ بعد میں دیکھیں گے کہ یہ چیز اسلام کے موافق ہے یا مخالف۔''

۲:..... ''یہاں (کیمبرج یونیورسٹی میں) ڈارون کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے عربی زبان بھی پڑھی۔ اس کے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے، اس میں اس نے اپنے عربی اساتذہ کے نام لکھے ہیں اور بے حد ادب واحترام سے ان کا نام لیا ہے۔''

۳:..... ''میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں کیمبرج

یونیورسٹی میں عربی کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں یا تو ''اخوان الصفا'' کے اقتباسات ہوں گے یا ابن مسکویہ کی ''الفوز الاصغر'' کے انتخابات۔ ان دونوں کتابوں میں ارتقاء کا نظریہ بیان کیا گیا ہے اور آپ کو معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ان کی زندگی میں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کبھی انہیں کافر قرار نہیں دیا گیا۔''

۴:..... ''ان کتابوں میں لکھا ہے کہ خدا پہلے مادہ کو پیدا کرتا ہے اور اس مادہ میں ترقی کی قوت عطا کرتا ہے۔ لہٰذا مادہ اولاً بخار یا دھویں کی صورت اختیار کرتا ہے۔ پھر ترقی کرتے ہوئے پانی کی صورت اختیار کرتا ہے۔ پھر ترقی کرتے ہوئے جمادات کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جمادات ترقی کرتے ہوئے مختلف قسم کے پتھر بنتے ہیں اور بالآخر وہ مرجان کی صورت اختیار کرتے ہیں جو ہوتے تو پتھر ہیں لیکن ان میں درخت کی سی شاخیں ہوتی ہیں۔''

۵:..... ''پھر جمادات کے بعد نباتات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے..... پھر اس کے بعد ادنیٰ ترین قسم کا حیوان پیدا ہوتا ہے۔ وہ ترقی کرتے کرتے کیا بنتا ہے؟ ابن مسکویہ بیان کرتا ہے، اخوان الصفا میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ بندر کی شکل اختیار کر لیتا ہے..... یہ ڈارون کا بیان نہیں ہے۔ یہ مسلمان حکماً کا بیان ہے۔''

۶:..... ''پھر اس کے بعد ترقی کرتا ہے تو ادنیٰ قسم کا

انسان بنتا ہے.....وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ترین انسان بنتا ہے۔ یہ بشر، ولی اور پیغمبر ہوتا ہے۔"

۷:....."پھر اس سے بھی ترقی کر کے فرشتہ بنتا ہے۔"

۸:....."پھر فرشتوں کے بعد ذات باری تعالیٰ خدا ہی کی ذات ہوتی ہے۔ ہر چیز خدا سے شروع ہوکر پھر خدا ہی کی طرف جاتی ہے۔ و الیہ المرجع و المآب۔"

۹:....."ہمارا تصور یہ ہے کہ اللہ ایک کمہار کی طرح مٹی کو لیتا ہے اور اس کے اندر مورت بناتا ہے۔ اس کے اندر روح پھونکتا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو، میں انکار نہیں کرتا۔ لیکن آپ ان آیتوں کا کیا کریں گے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو مٹی اور پھر نطفے سے پیدا کیا۔"

۱۰:.....ایک اور آیت کو لیجئے: "خلقکم اطوارا" خدا نے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا۔ "طور" وہی لفظ ہے جس سے تطوّر (Evolution) بنایا گیا ہے۔ خدا نے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا، اس کے معنیٰ یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اولاً جمادات کی شکل میں بنایا، پھر وہ جمادات ترقی کرتے ہوئے نباتات بنتے ہیں، پھر حیوان بنتے ہیں۔"

یہ اقتباسات خطبات (چوتھا ایڈیشن) کے صفحہ ۲۱۶ تا ۲۱۸ سے لئے گئے

ہیں۔

ایک ضروری گزارش :

محترم قارئین ! ذرا رک جایئے، آگے بڑھنے سے پہلے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ دہرا کر اپنا ایمان تازہ کر لیجئے۔ خلافت عباسیہ کا آفتاب عروج پر ہے۔ معتزلی علماً دربار خلافت پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک من گھڑت مسئلہ، بزور، علماً حق سے منوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حضرت امام احمدؒ وقت کے سب سے بڑے محدث اور دینی رہنما ہیں۔ آپؒ باطل کے سامنے سر جھکانے سے انکاری ہیں۔ ادھر کرۂ ارض کی سب سے بڑی سلطنت، جبر و تشدد پر اتر آتی ہے۔ نرم و نازک بدن پر کوڑوں کی بارش ہو رہی ہے، مگر امام عالی مقام کی زبان سے ایک ہی جملہ نکل رہا ہے :

"ایتونی بشئ من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتیٰ اقول بہ."

ترجمہ:..... "اللہ کی کتاب یا رسول اللہ کی حدیث سے کوئی دلیل لے آؤ تو میں مان سکتا ہوں۔"

اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ رسول اللہ ﷺ امت کو یہ جو وصیت فرما گئے تھے :

"ترکت فیکم امرین لن تضلوا بعدی ما تمسکتم بھما، کتاب اللہ وسنتی." (مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ:..... "میں تم میں ایسی دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ جب تک تم ان کو تھامے رہو گے تم گمراہ نہیں ہو گے۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت۔"

اگر ایسے کٹھن وقت میں امام احمد بن حنبلؒ، فرمان رسول (ﷺ) کی لاج نہ رکھتے تو اور کون رکھتا؟ اور ہاں..... قارئین کو وہ بھی یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ سیدنا عمر فاروقؓ تورات کے کچھ اوراق، آنحضرت ﷺ کے سامنے لے آئے تھے۔ حضورؐ یہ سن کر خاموش رہے تو حضرت عمرؓ نے انہیں پڑھنا شروع کردیا۔ ادھر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہونے لگا تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو سختی سے ٹوکتے ہوئے کہا: تم دیکھتے نہیں ہو کہ چہرۂ انور پر کیا گزر رہی ہے؟ حضرت عمرؓ نے رخ انور کی طرف دیکھا تو فوراً کہا:

"اعوذ بالله من غضب الله و غضب رسوله ﷺ رضينا بالله ربا و بالاسلام دينا و بمحمد نبيا."

ترجمہ:..... "میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اللہ کے غضب اور اس کے رسولؐ کے غضب سے۔ ہم اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمدؐ کے نبی ہونے پر راضی ہیں۔"

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سن لو، جس ذات کے قبضے میں محمد کی جان ہے، اس کی قسم اگر (بالفرض) حضرت موسیٰؑ سامنے آجائیں اور تم ان کے پیچھے لگ کر مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ اور اگر حضرت موسیٰؑ زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پالیتے تو وہ ضرور میرا ہی اتباع کرتے۔ (اس حدیث کے تحت شارح مشکوٰۃ شریف حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: "وفی الحدیث نهی بلیغ عن العدول من الکتاب و السنة الی غیرهما من کتب الحکماء و الفلاسفة")۔ (مرقاۃ ج:۱ ص:۲۶۲)

سطور بالا سے یہ بات قارئین پر واضح ہوگئی کہ ہر وہ مسئلہ جس کے ڈانڈے

اسلامی عقائد ونظریات سے ملتے ہوں، ان میں اندھا دھند کسی کے پیچھے چل پڑنے کا کوئی جواز نہیں۔ کتاب وسنت کا سہارا لینا ضروری ہے۔ آئندہ سطور میں ہم اسی کی زحمت اپنے قارئین کو دیں گے۔ وباللہ التوفیق۔

ڈارون کون تھا؟

ڈارون، انگلستان کا رہنے والا ایک سائنس دان تھا۔ اس کی پیدائش ۱۸۰۹ء میں ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی وغیرہ میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس نے مطالعۂ کائنات کو اپنا مشن بنایا۔ بیس برس کے مسلسل تجربات اور مشاہدات کے بعد اس نے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا Origin of The Species (انواع مخلوق کی اصل) کے نام سے اس نے اپنی کتاب شائع کی جس نے لکھی پڑھی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں پہلی مرتبہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچی۔ اب اس کو ڈیڑھ صدی ہونے کو ہے کہ اس نظریہ کے بارے میں نفیاً اثباتاً قلم کاروں کی مساعی سامنے آرہی ہیں۔

ڈارونی نظریہ کا پس منظر:

تاریخ کے طالب علموں کو معلوم ہوگا کہ مسیحیت کی علم دشمنی، تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ غالباً چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں رومی بادشاہ، قسطنطین اوّل نے عیسائیت کو قبول کیا، جس کے بعد عیسائیت نے یورپ میں زور پکڑ لیا۔ رومی سلطنت پرانی دنیا کے تین براعظموں (یورپ، ایشیا اور افریقہ) کے بیشتر ممالک پر چھائی ہوئی تھی۔ کلیسا (CHURCH) کی تنگ نظری اور علم دشمنی کی داستان طویل بھی ہے اور انتہائی وحشت ناک بھی۔ پاپائے روم کے حکم سے ایک محکمۂ احتساب قائم ہوا، جس کے فیصلوں سے تین سال کے عرصہ میں تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزائیں سنائی

گئیں، ان میں ۳۲ ہزار انسانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ظلم وستم اور جبر وقہر کا سب سے بڑا نشانہ یہودی تھے، اس لئے کہ وہ رائج الوقت علوم وفنون کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

زمانہ کروٹ بدلتا ہے اور تاریخ، ورق الٹتی ہے۔ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا نظام ہزاروں، لاکھوں سال سے چلا آرہا ہے۔ عقیدۂ ولدیت (کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں) کے ماننے والوں کا زور ٹوٹا۔ صنعتی انقلاب کے بعد دنیا کو جدید سائنس کا لوہا ماننا پڑا۔ اب قرآن پاک کی اس پیش گوئی کے مطابق کہ عقیدۂ ولدیت کے نتائج اتنے بھیانک اور روح فرسا ہیں کہ نبی آخر الزمان ﷺ انہیں سوچ سوچ کر لرز جاتے تھے: ''فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰی آثَارِهِمْ'' (سورۂ کہف: ۶) ڈارونی.....اور..... مارکسی نظریات ہی نہیں، اور بھی متعدد فتنے علمی افکار (Scientific Theories) کی شکلوں میں نمودار ہونے لگے۔ مذہبی انارکی نے عالمگیر وبا کی صورت اختیار کرلی۔

ڈارونیت کا استقبال کیونکر ہوا؟

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء کیا ہے؟ یہاں تفصیل سے بتانا بڑا مشکل ہے، البتہ آگے چل کر ہم جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے اوپر دیئے گئے اقتباسات پر گفتگو کریں گے تو اس ضمن میں اس کا ذکر آجائے گا۔ یہاں پر اتنا بتا دینا مناسب ہوگا کہ خود سائنسی دنیا کے بہت سے نامور فضلاء اس نظریہ کو مضحکہ خیز اور مغالطہ انگیز قرار دے چکے ہیں۔ آکسفورڈ سے ایک کتاب The Encyclopadia of Ignorance کے نام سے شائع ہوئی جو ۶۰ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک مقالہ:

The Fallacies of Evolation Theory

کے عنوان سے شامل ہے جس کے لفظی معنیٰ ہیں ''نظریۂ ارتقاءٔ کے مغالطے''۔

اس سے قطع نظر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بنیادی طور پر نظریۂ ارتقاءٔ مذہب پر کس حد تک اثر انداز ہوا۔ یہودیوں کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے:

Protocols of The Learned Elders of Zion

یعنی ''اکابر علماءٔ القدس کے معاہدات'' اس کا عربی ترجمہ ''بروتوکولات صھیون'' کے نام سے بیس سال پیشتر مکہ مکرمہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے دو اقتباس یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

۱:.....''اذکروا نجاح دارون و مارکس و نتشه، فنحن الذین اوجدناهم و تعلمون جمیعا ما کان لسموم هذه المذاهب من اثر فی اخلاق القوییم و عقولهم ..... یجب ان ندرس بدقة و عنایة آراء الشعوب و اخلاقها و میولها.''

ترجمہ:.....''تم لوگ یاد رکھو کہ ڈارون، مارکس اور نیٹشے کس طرح کامیاب ہوئے۔ ہم ہی تو ان کو وجود میں لائے اور تم سب یہ بھی جانتے ہو کہ ان افکار کے زہر کس طرح ہمارے مخالفین کے اخلاق اور ان کی عقلوں پر اثر انداز ہوئے.....ضروری ہے کہ ہم بڑی دقتِ نظر اور انہماک سے قوموں کے نظریات، ان کے اخلاق اور رجحانات کا مطالعہ کریں.....''

۲:.....''ان دارون لیس یهودیا، و لکننا عرفنا

کیف ننشر اٰراء ہ علی نطاق واسع و نستغلھا فی تحطیم الدین۔"

ترجمہ:....."ڈارون یہودی تو نہیں ہے، لیکن ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم اس کے نظریات کو ایک بڑے پیمانہ پر کس طرح پھیلا سکتے ہیں اور دین کو پاش پاش کرنے میں کیونکر اس سے امداد لے سکتے ہیں۔"

ایک اور عبارت کا ملخص ترجمہ کچھ اس طرح ہے:

"ہمارے مخالفین اس حد تک عاجز ہو چکے ہیں کہ وہ ہمارے علمی افکار سے باہر سوچ ہی نہیں سکتے۔ اسی چیز کا ہم پورا پورا اہتمام کرتے ہیں اور یہی وہ تعلیم ہے جو درس گاہوں میں دینا ضروری ہے۔ انسانی زندگی اور اس کے اجتماعی اصول کا علم۔"

ڈارون کا مقام ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں:

محترم ڈاکٹر صاحب نے ڈارون کی منقبت سرائی میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ ان کے ریمارکس مختصراً یوں ہیں:

الف:.....ڈارون نے عربی زبان سیکھ لی تھی۔

ب:.....ڈارون نے اپنے عربی اساتذہ کے نام بڑے احترام سے لئے ہیں۔

ج:.....اس کا نظریۂ ارتقاء دراصل اخوان الصفا اور ابن مسکویہ جیسے حکماءِ اسلام کے نظریات کا چربہ ہے۔

د:.....ان حکماء کو ان کی زندگی میں کافر قرار نہیں دیا گیا تھا، تو ڈارون کے نظریہ کو بھی اسلام کے خلاف نہیں کہہ سکتے۔ ڈارون کو ملحد اور خدا کا منکر قرار دینا ایک مفروضہ ہے۔

بول چال میں پاکیزہ اور شستہ زبان کا استعمال یقیناً قابل تعریف ہے اور یہ ڈاکٹر صاحب کی خوبی ہے۔ لیکن..... سوال یہ ہے کہ کیا محض عربی زبان کا سیکھ لینا کسی کو کفر سے بچانے کے لئے کافی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو عربی لغت المنجد کا مصنف ''لویس معلوف'' یقیناً اس دور کا سب سے بڑا مسلمان ہوتا۔ ڈارون بیچارے کو تو عربی زبان سیکھنا پڑی، لاکھوں عیسائی اور یہودی عربی زبان میں مہارت رکھتے ہیں اور آج وہ بین الاقوامی شہرت کی حامل یونیورسٹی میں عربی زبان کی تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ہندو دھرم کا مشہور بدنام زمانہ مصنف ''پنڈت دیانند سرسوتی'' عربی زبان خوب جانتا تھا تو ڈاکٹر صاحب ان سب کے بارے میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟

عربی اساتذہ کے نام احترام سے لینا تو ایک طرف رہا، حدیث اور سیرت طیبہ کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے کہ قیصر روم، ہرقل نے خود نبی عربی ﷺ کا غائبانہ کس قدر احترام کیا، مگر کیا کسی نے اسے مسلمان قرار دیا؟ مسٹر گاندھی آنجہانی نے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی بڑی تعریف کی۔ رئیس الاحرار نے فرمایا: پھر انتظار کس چیز کا ہے، کلمہ پڑھ لیجئے۔ اس پر آنجہانی خاموش ہوگئے۔ دِلّو رام کوثری، بھگوان داس، عرش ملسیانی جیسے ہندو شعراء اور سینکڑوں ہندو، سکھ، عیسائی اور دیگر غیر مسلم مصنفین نے بارگاہ نبوت میں عقیدت کے پھول نذر کئے، لیکن کیا ان میں سے کسی کو مسلمان قرار دیا جاتا ہے؟ ان صفحات میں گنجائش نہیں، ورنہ تو ہم ذرا کھول کر بیان کرتے کہ سچا جاننے اور سچا ماننے میں فرق ہے۔

اخوان الصفا اور ابن مسکویہ جیسے قدیم فلسفہ دان، جنہیں ڈاکٹر صاحب یا اور اہل علم ''حکماءِ اسلام'' کے گراں قدر خطاب (Title) سے نوازتے ہیں، بڑی ستم ظریفی ہے کہ ڈاکٹر صاحب، ڈارون کو ان کا خوشہ چیں بتا کر ڈارونی نظریہ کو حیات جاوید اور استحکام بخشنا چاہتے ہیں، ورنہ تو اس نظریہ کو اسلام کے مطابق قرار دینے کے لئے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔

سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ ''حکمت'' اور ''حکیم'' کے قرآنی الفاظ کو بالکل بے محل اور بے جا طور پر فلسفۂ یونان اور اس کے جاننے والوں کے لئے استعمال کیا گیا۔ فلسفۂ یونان نے بلاشبہ انسانی معاشرہ کو بہت سی مفید اور کارآمد چیزیں بھی دیں، لیکن اس کا ایک بڑا حصہ اوھام اور مفروضات پر مشتمل ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق:

الف:..... مادہ قدیم ہے۔

ب:..... الواحد لا یصدر منه الا الواحد۔

ج:..... واجب الوجود نے صرف عقل اول کو پیدا کیا۔ عقل اول نے عقل ثانی اور فلک اول کو پیدا کیا۔ اس طرح ہوتے ہوتے عقل تاسع نے عقل عاشر اور فلک تاسع کو پیدا کیا۔ پھر عقل عاشر نے باقی ساری کائنات کو پیدا کیا۔

د:..... ان فلاسفہ نے افلاک کی جو ہیئت بیان کی ہے، آج پڑھے لکھے بچے بھی اسے سنتے ہیں، تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں: ذٰلِکَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔

ھ:..... افلاک خرق والتیام کو قبول نہیں کرتے۔ وغیر ذلک من الخرافات۔

''حکمت'' کا لفظ قرآن کریم میں تقریباً بیس مرتبہ آیا ہے اور ہر جگہ اس سے ''علوم نبوت'' مراد ہیں نہ کہ یونانی فلسفہ۔ بڑا ظلم ڈھاتا ہے اور تفسیر بالرائی کے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے وہ شخص جو قرآن کریم کے لفظ حکمۃ سے یونانی طب یا یونانی فلسفہ مراد

لیتا ہے۔ اس فلسفہ کی بڑی بڑی کتابیں آج بھی مدارس عربیہ میں پڑھائی جارہی ہیں، طلبہ ان کو رٹ لیتے ہیں، بلکہ دیمک کی طرح چاٹ لیتے ہیں، مگر حاصل ندارد۔ یہ بیچارے اتنا بھی نہیں بتاسکتے کہ چراغ کو پھونک مارو تو بجھ جاتا ہے، مگر چولھے میں ہوا کرو تو آگ جل اٹھتی ہے۔ کیا وجہ ہے؟ آدمی سائیکل پر سوار ہوکر کھڑا رہنا چاہے تو سہارے کے بغیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ گر پڑتا ہے، مگر پیڈل مارتا ہوا آگے کو حرکت کرتا ہے تو یہ جا، وہ جا۔ اس میں کیا راز ہے؟

میں عرض یہ کررہا تھا کہ حکمت اور حکیم کا لفظ قرآن مجید سے چراکر یونانی فلاسفہ اور ان کے پیروکاروں پر چسپاں کردیا گیا، چلئے ''دانایاں در پئے الفاظ نمے روند'' کے تحت ہم اس بات کو چھوڑتے ہیں، مگر یہ کیونکر فرض کرلیا گیا کہ ان فلاسفۂ یونان یا دانایان فرنگ کے منہ اور قلم سے نکلی ہوئی ہر بات کو سر پر رکھنا اور آنکھوں سے لگانا ضروری ہے؟

اخوان الصفاء دراصل چند لکھے پڑھے لوگوں کی ایک جماعت کا نام ہے، جس نے اعتزال کی کوکھ سے جنم لیا اور شیعیت کی گود میں پرورش پائی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ معتزلہ نے اپنے لئے ''اصحاب العدل والتوحید'' کا ٹائٹل منتخب کیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے لئے ''اھل الصفاء والایمان'' کا لقب چنا، جو شدہ شدہ ''اخوان الصفاء'' بن گیا۔ ''رسائل اخوان الصفاء'' ۵۲ باون مختلف مقالات کا مجموعہ ہے، جن میں مصنفین نے اپنے نقطۂ نگاہ سے الٰہیات اور دیگر عنوانات پر گفتگو کی ہے۔ جو لوگ فرقۂ اسمٰعیلیہ (قرامطہ) کی تاریخ سے واقف ہیں، انہیں مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وہ گروہ ہے جس نے حسن بن صباح کی سرکردگی میں دنیائے اسلام میں تہلکہ مچادیا تھا۔ قلعۂ الموت کی فردوس بریں بھی اسی کا کارنامہ ہے۔ شاید ان لوگوں کی یہی ''اسلام

دوستی" ہے جس کی بنا پر گولڈ زیہر جیسے متعصب مستشرق نے ان کے حالات میں دلچسپی لی۔ علماءِ اسلام نے ان کے بارے میں کیا کہا، یہ ایک تفصیل طلب کہانی ہے۔ پھر تو پہلے ان لوگوں کے عقائد کا بیان کیا جائے اور اس کے بعد علماءِ امت کی آراء کا ذکر ہو۔

ابن مسکویہ (جس کو مسکویہ کہنا زیادہ صحیح ہے) بھی چوتھی صدی ہجری میں پیدا ہوا۔ وہ ابونصر فارابی کا شاگرد تھا۔ شروع میں امراءِ سلطنت کے ہاں ملازم رہا۔ پڑھنے لکھنے کا بڑا شوقین تھا۔ وہ ارسطو کے فلسفہ کا شارح بن کر ابھرا۔ اس نے بیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ الرئیس بوعلی ابن سینا اور بعض دوسرے مصنفین اسے ایک کیمیا دان (Chemist) قرار دیتے ہیں کہ یہ پارس کے پتھر کی تلاش میں پھرتا رہتا تھا۔

اب اخوان الصفاء ہوں یا ابن مسکویہ یونانی فلسفہ کے ترجمان اور شارح کی حیثیت سے آپ ان کو جتنا اونچا مقام دیں، آپ جانیں اور آپ کا کام، سوال یہ ہے کہ کتاب وسنت کے شارح، فقہ اسلامی کے ماہر اور فلسفۂ اسلامیات کے رمز شناس کی حیثیت سے بھی ان کا نام لیا جاسکتا ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ تو پھر آپ اسلامیات کے طالب علم کو ان کا راستہ کیوں دکھاتے ہیں؟

ما قصۂ اسکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

نظریۂ ارتقاء کا خلاصہ:

ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق نظریۂ ارتقاء کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

۱:.....خدا نے..... پہلے..... مادہ کو پیدا کیا۔

۲:.....وہ مادہ..... ترقی کرتے کرتے... بخار یا دھواں بن

گیا۔

۳:.....اس دھویں نے..... ترقی کرتے کرتے... پانی کی شکل اختیار کرلی۔

۴:.....وہ پانی..... ترقی کرتے کرتے... جمادات میں تبدیل ہوا۔

۵:.....جمادات..... ترقی کرتے کرتے... مختلف اشیاً اور بالآخر مرجان بنیں۔

۶:.....جمادات..... کے بعد..... نباتات کا سلسلہ شروع ہوا۔

۷:.....نباتات..... کے بعد..... ادنیٰ ترین حیوان بنا۔

۸:.....ادنیٰ ترین حیوان نے... ترقی کرتے کرتے... بندر کی شکل اختیار کرلی۔

۹:.....بندر..... ترقی کرتے کرتے... ادنیٰ قسم کا انسان بنا۔

۱۰:.....ادنیٰ انسان..... ترقی کرتے کرتے... ولی اور پیغمبر بنا۔

۱۱:.....ولی اور پیغمبر..... .... ترقی کرتے کرتے... فرشتہ بنا۔

۱۲:.....فرشتوں..... کے بعد..... خدا کی ذات ہوتی ہے۔

یوں ہر چیز خدا سے شروع ہوکر خدا ہی کی طرف جاتی ہے۔"و الیه المرجع و المآب"۔

بات پہلے ہی خاصی طویل ہوگئی ہے۔ اب اگر ہم ڈاکٹر صاحب کے

ارشادات کا تفصیلی جائزہ لیں تو نہیں کہا جاسکتا کہ معاملہ کہاں تک پہنچ جائے گا۔ اس لئے ہم قارئین سے معذرت کے ساتھ چند ہی نکات پر قناعت کریں گے۔ واللہ یہدینا السبیل۔

ا:.....کیا انسانی تخلیق فرشتوں سے پہلے ہوئی؟

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ انسانوں کی ترقی یافتہ نوع (ولی اور پیغمبر) سے فرشتہ بنا۔ اب قطع نظر اس سے کہ اللہ کے نزدیک انسان کا مرتبہ و مقام بلند ہے یا فرشتہ کا، اتنا تو قرآنی تصریحات سے ثابت ہے کہ آدم کی تخلیق فرشتوں کے بعد ہوئی۔ چنانچہ فرمایا گیا: "اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّی خَالِقٌ بَشَرًا." (سورۃ الحجر:۲۸)۔

ترجمہ:....."اس وقت کو یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں انسان کو پیدا کرنے والا ہوں۔" یہ الفاظ دو جگہ آئے ہیں ایک سورۃ حجر۔ آیت :۲۸ اور دوسرے سورۃ ص۔ آیت:۷۱۔ اور یہی مضمون دوسرے لفظوں میں اور بھی کئی جگہ آیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو علم حدیث سے مناسبت ہے تو حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کو بھی نظر انداز کر دیا کہ فرشتوں کی پیدائش نور سے ہوئی ہے اور انسانوں کی مٹی سے۔ (دیکھئے مسلم شریف ص:)

اور ہاں یہ بھی غور طلب ہے کہ کافروں کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اس بات کا اعتراف رہا کہ وہ بشر ہیں۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام سے ان کی قوم نے کہا تھا:

مَا نَرٰکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا۔ (سورۃ ہود:۲۷)، وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (سورۃ بنی

اسرائیل:۹۴)، قوم ثمود نے کہا تھا : اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (سورۃ القمر:۲۴)، تو کیوں نہ ایسے مواقع پر کفار کو یہ جواب دیا گیا : نادانو! انسانوں کی ایک کھیپ ترقی کر کے فرشتوں میں بدل گئی ہے، آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا، ولی اور پیغمبر Develop ہو کر فرشتے بنتے رہیں گے۔ وقت آنے پر یہ ہو جائے گا، تم ایمان تو لے آؤ؟ الٹا ان سے یہ کہا جاتا رہا کہ دیکھو، ہمیشہ انسان ہی نبی بن کر آتے رہے اور وہ انسان ہی رہے۔ اسی حالت میں وہ دنیا سے رحلت کر گئے۔ تمہارا یہ اعتراض غلط اور عبث ہے۔ اسے واپس لے لو۔

۲:..... کیا انسانی تخلیق کوئی امتیازی شان رکھتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب تو یہ فرما کر فارغ ہو گئے کہ ''بندر سے انسان بنا'' گویا یہ تمام ارتقائی مراحل Automatically طے ہوتے رہے، لیکن وہ اس قرآنی تصریح کا کیا کریں گے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے پر جواب طلبی کی تو فرمایا:

''مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ.''

(ص:۷۵)

ترجمہ:..... ''تجھے کس چیز نے روکا تھا کہ تو اس کو سجدہ کرتا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔''

اس میں ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ رب العزت نے یہ جو فرمایا کہ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا، اس سے انسانی تخلیق کی امتیازی شان کا اظہار مقصود ہے۔ اللہ کی ذات بے چون و بے چگون ہے، اسی طرح اس

کے افعال بھی انسانی فہم سے بالاتر اور بے مثال ہیں۔ اس کی کوئی وضاحت تو نہیں کی جاسکتی، اتنا بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی پیدائش کسی ارتقائی مرحلہ کے طور پر نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت کا براہ راست کوئی شاہکار ہے۔

اس کی مزید تائید ایک حدیث شریف سے ہوتی ہے جو بخاری اور مسلم کے علاوہ دوسرے بہت سے کبار محدثین نے نقل کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خلق الله ادم علیٰ صورته'' (صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۲۷)۔ اس حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ البتہ اس بارے میں شارحین کے دو قول پائے جاتے ہیں کہ صورتہ کی ضمیر کس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بیشتر علمائ یہ کہتے ہیں کہ اس کا مرجع اٰدمُ کا لفظ ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام جس شکل و صورت کے ساتھ زمین پر رہتے تھے، شروع سے ان کی تخلیق اسی شکل وصورت میں ہوئی۔ اسی سے وہ بہشت میں رہے، اسی سے وہ دنیا میں تشریف لائے اور اسی پر ان کی وفات ہوئی۔ (نووی شرح مسلم ج:۲ ص:۳۲۷، اور فتح الباری شرح بخاری)

محدثین کا دوسرا قول یہ ہے کہ ہ ضمیر اللہ کی طرف راجع ہوگی۔ اور اضافت تشریفیہ ہوگی (اضافت تشریفیہ کا مطلب قارئین پوری طرح سمجھ لیں کہ مضاف الیہ کی وجہ سے مضاف میں بھی عظمت اور برتری آجائے۔ مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ناقۃ اللہ کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اونٹنی اللہ تعالیٰ کے لئے سواری کا کام دیتی تھی۔ بیت اللہ کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری تمہاری طرح اس گھر میں ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں، بلکہ اللہ کی طرف مضاف کرکے اس اونٹنی اور اس گھر کی عظمت شان کا اظہار مطلوب ہے۔ اسی طرح ''اللہ کی صورت'' سے مراد اس صورت کا عظیم الشان اور برتر ہونا بتایا گیا ہے اور بس)۔ دونوں میں سے جو قول بھی لیا جائے، ڈارونی

نظریہ ھباءً منثوراً ہوجاتا ہے۔ پہلے قول کے مطابق تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تصریح فرمادی کہ حضرت آدم علیہ السلام شروع ہی سے معروف انسانی شکل پر پیدا ہوئے تھے۔ دوسرے قول کے مطابق، رسول اللہ ﷺ تو نسل انسانی کے باوا کی عظمت ان الفاظ میں بیان فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی شکل پر پیدا فرمایا۔ اب کسی کی کیا مجال کہ وہ انسان کو ترقی یافتہ بندر قرار دے؟ العیاذ باللہ۔

حدیث بالا میں جو کچھ بیان ہوا ہے، یہ ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام کے بارے میں تھا۔ رہ گئی ان کی نسل اور اولاد تو قرآن مجید میں اس کے متعلق نہایت واضح طور پر فرما دیا گیا ہے: ''هُوَ الَّذِی یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ''۔ (سورہ آل عمران:۶) یعنی وہ اللہ ہی جس طرح چاہتا ہے ماؤں کی رحموں میں تمہاری صورتیں بنادیتا ہے۔

ایک طرف اللہ رب العزت کا فرمان گرامی ہے جو الخالق الباری المصور ہے۔ دوسری طرف قدیم فلاسفہ یا مسٹر ڈارون کا بے سروپا نظریہ ہے۔ اللہ نے جو کچھ فرمایا، وہ حقیقت ہے اور ڈارون نے جو کچھ کہا، وہ محض (THEORY) تھیوری ہے۔ حقیقت کے مقابلے میں نظریے کی رٹ لگائے جانا محض ابلہ فریبی اور سفطہ پردازی ہے۔ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ۔ (سورۂ بقرہ:۱۴۰)

۳۔ کیا نبوت ایک کسبی چیز ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے یہ کمال کردیا ہے کہ ادنیٰ انسان کو پیغمبر کے درجے تک پہنچادیا۔ گویا ان کی رائے میں پیغمبر Promotee ہوتا ہے۔ یعنی ایک عام آدمی نیکی میں ترقی کرتے کرتے ''نبی'' کا درجہ حاصل کرسکتا ہے، حالانکہ علماءِ امت کے نزدیک نبوت کسبی شے نہیں، محض اور محض وہبی چیز ہے۔ ہر نبی (Selected) منتخب ہوتا ہے،

چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ"

(سورہ الحج:۷۵)

ترجمہ:....."اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے پیغامبروں کو چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔"

۴:.....کیا نظریۂ ارتقاء کا تعلق اللہ کی ذات سے بھی ہے؟

بیچارے ڈارون یا اس نے نظریۂ ارتقاء، جو کچھ بھی بیان کیا تھا، اس کا تعلق صرف مخلوق سے تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے غضب یہ ڈھایا کہ خالق یعنی اللہ کی ذات سے بھی اس کا تعلق جوڑ دیا۔ قارئین خود ہی سوچیں کہ "فرشتوں کے بعد خدا ہی کی ذات ہوتی ہے"۔ اس جملے کا کیا مطلب ہے؟

پھر صاحب موصوف نے "الیه المرجع و المآب" کا عربی جملہ یوں فٹ کیا ہے کہ گویا یہ کوئی قرآنی آیت ہے اور وہ اپنے موقف کی تائید میں اسے یہاں نقل فرما رہے ہیں۔

نظریۂ انقلاب اور قرآن کریم:

یہ تو ایک مسلّمہ ہے کہ نسل انسانی کو پیدائش کے سلسلہ میں کئی ایک انقلابی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب اس (Evolution Theory) نظریۂ انقلاب کی ایک تشریح اور تعبیر وہ ہے جو قدیم سے مفسرین اور دیگر علماء امت کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ تشریح قرآن پاک کی سورۂ مؤمنون آیات نمبر ۱۲ تا نمبر ۱۴ وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ اس کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

"مٹی کے جوہر یعنی غذا سے نطفہ بنا۔ نطفہ سے خون کا لوتھڑا۔ لوتھڑے سے گوشت کا ٹکڑا یعنی بوٹی۔ بوٹی پر ہڈیوں کا اضافہ ہوا۔ ہڈیوں کو گوشت کا لباس ملا۔ پھر اس میں ایک اور تخلیقی اضافہ ہوا یعنی اس میں روح پھونکی گئی۔"

انقلاب کی دوسری تشریح اور تعبیر وہ ہے جو ڈارونی نظریہ سے اتفاق کرنے والے بعض جدید علماء نے کی۔ پیچھے اقتباس نمبر ۱۰ میں قرآنی آیت "خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا" کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحب کا فرمان نقل ہو چکا ہے کہ:

"خدا نے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا۔ اس کے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اولاً جمادات کی شکل میں بنایا۔ پھر وہ جمادات ترقی کرتے ہوئے نباتات بنتے ہیں، پھر حیوان بنتے ہیں۔"

آیئے، ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے، ہم اس گتھی کو سلجھانے کے لئے خود خالق کائنات کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ درج ذیل تین سوالات ذہن میں رکھئے:

(۱) بنی نوع انسان کا آغاز کس طرح ہوا؟

(۲) آگے یہ سلسلہ کیونکر چلا؟

(۳) تطوّرات یعنی تحقیقی انقلابات کس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں؟

پہلے سوال کا جواب ہمیں ان الفاظ میں ملتا ہے: "خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ" (سورۂ نساء:۱، اعراف:۱۸۹، سورۂ زمر:۵) بنی نوع انسان کا آغاز فرد واحد

سے ہوا۔ یہ کسی اور حیوانی مخلوق کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے بلکہ ایک منصوبہ بندی کے تحت، دست قدرت نے خاکی عنصر سے اس کا پتلا تیار کیا: "خَلَقْتُ بِيَدَيَّ"۔ پھر اس میں نہایت اعلیٰ اور ارفع شان کی روح پھونکی: "وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُوْحِيْ"۔ اس طرح ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام وجود میں آئے۔

دوسرے سوال کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت آدم کے فطری اور طبعی تقاضا کے مطابق ان کی رفیقۂ حیات (حضرت حواؑ) کو انہی کی جنس سے پیدا فرمایا۔ "وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا" (سورۂ نساء:۱)، "جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا" (اعراف: ۱۸۹، زمر: ٦)۔ اس کے بعد فرمایا کہ پھر ان دونوں کے میل ملاپ سے نسل انسانی کا سلسلہ چلا: "وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَ نِسَاءً" (سورۂ نساء:۱) حقیقت یہ ہے کہ اس قرآنی بیان نے ڈارونی نظریہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

رہا تیسرا سوال کہ تخلیقی انقلابات کب اور کہاں وقوع پذیر ہوتے ہیں تو اس بارے میں قرآن یہ کہتا ہے:

"يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ"

(سورۂ زمر:٦)

ترجمہ:..... "اللہ تعالیٰ تمہیں، تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک شکل کے بعد دوسری شکل دے کر تین اندھیروں میں بناتا ہے۔

مفسرین نے تین اندھیروں کی وضاحت اس طرح سے کی ہے کہ ایک تو بچے کے اوپر ایک جھلی چڑھی ہوئی ہوتی ہے، پھر وہ بچہ رحم کے اندر ہوتا ہے۔ رحم کے اوپر شکم مادر کی تاریکی ہوگئی۔ اس آیت میں بالکل صراحت فرمادی گئی کہ نطفہ سے لے کر آدم زاد بننے تک جتنے بھی تطوّرات سے واسطہ پڑتا ہے اور جتنے بھی مراحل گزرتے ہیں، یہ سب

مراحل ماں کے پیٹ ہی میں طے ہوتے ہیں۔ انہی تخلیقی مراحل کو دوسرے مقام پر: "خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تو اس آیت کی ماڈرن تفسیر..... کہ جمادات سے نباتات، نباتات سے حیوانات، حیوانات سے ایک اعلیٰ قسم یعنی بندر، اور بندر سے انسان..... بننے کے انقلابات مراد ہیں، اسے ہم ڈارونی نظریہ کو قرآنی ثبوت مہیا کرنے کی سعی ناکام اور کوشش رائگاں کا نام تو دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

تفسیر ماجدی میں لکھا ہے کہ الہ آباد کے ایک نامور وممتاز ہندو ڈاکٹر، در پردہ مسلمان ہوگئے تھے اور اسی آیت کی بناء پر قرآن کی صداقت کے قائل ہوگئے تھے۔ کہتے تھے ایک امی عرب کے لئے اس گہری طبی حقیقت سے، آج سے تیرہ چودہ سو برس پہلے واقف ہوجانا ناممکن تھا۔

قرآن کریم کوئی (Biology) حیاتیات کی کتاب نہیں ہے۔ مقام حیرت ہے کہ اغیار تو اس کے انکشافات کو پڑھ کر سر دُھنتے رہیں اور اپنوں کا یہ حال کہ غیروں کی خاطر قرآنی تشریحات کو بدل دیں۔ فیا للعجب!

دو توجہ طلب باتیں:

(۱) آپ پیچھے پلٹ کر اقتباس نمبر ۹ اور ۱۰ کو پڑھئے۔ ڈاکٹر صاحب نے نظریۂ ارتقاء کے مخالفین پر ایک پھبتی کسی..... "ہمارا تصور یہ ہے کہ اللہ ایک کمہار کی طرح مٹی کو لیتا ہے اور اس کی مورت بناتا ہے۔ اس میں روح پھونکتا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام بن جاتے ہیں۔"..... استہزاء اور مخول کا یہ انداز ایک سنجیدہ اسکالر کو زیب نہیں دیتا۔ اور پھر عجیب تر یہ بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس کے بعد معاً یہ فرماتے ہیں:

4

''ممکن ہے، ایسا ہوا ہو۔ میں انکار نہیں کرتا''

اب کوئی ان سے پوچھے کہ حضرت! جس چیز کو آپ اپنے طنز لطیف کا نشانہ بناتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ دبے لفظوں میں آپ اس کی تائید بھی شروع کر دیتے ہیں؟ آج تک تو ہم یہی سنتے آرہے ہیں کہ: ''لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ''۔ اللہ کی ذات بے چون و بے چگون ہے۔ کبھی کسی عالم نے اس ذات کبریا کو ''کمہار'' سے تشبیہ دینے کی جرأت نہیں کی۔ آپ اس کے روادار کیونکر ہو گئے؟

(۲) قارئین کو ایک مرتبہ ہم پھر زحمت دیں گے کہ وہ مڑ کر اقتباس نمبر ا کو ملاحظہ فرمائیں اور اس نرالی منطق کی کوئی توجیہ ان کی سمجھ میں آتی ہو، تو ہمیں اس کے سننے کا انتظار رہے گا۔ فرماتے ہیں:

> ''ڈارون کے نظریے کو اسلام نے رد کر دیا ہے۔ اس کو ثابت کرنا آپ پر فرض ہے۔ بعد میں دیکھیں گے کہ یہ اسلام کے موافق ہے، یا مخالف۔''

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر فریق ثانی کتاب وسنت کی روشنی میں ڈارونی نظریہ کا غلط ہونا ثابت کر دے تو پھر بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ اسلام کے موافق ہے یا مخالف؟ جب فریق ثانی نے اپنا موقف دلائل سے ثابت کر دیا تو پھر دیکھنے اور سوچنے کی کیا گنجائش؟

جو لوگ اپنے دین وایمان کو ڈارونیت پر وار دینا چاہتے ہیں، ہم ان سے خیر خواہانہ التماس کریں گے کہ اخوان الصفاء ہوں یا ابن مسکویہ، ڈارون ہو یا ارنسٹ ہیکل ان میں سے کوئی بھی تخلیق کائنات کے وقت اللہ تعالیٰ کے پاس موجود نہ تھے اور ان میں

سے کوئی خالق کائنات کا شریک کار نہ تھا:

"مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا۔"

(سورۂ کہف:۵۱)

ترجمہ:..... "نہ تو آسمان اور زمین کے پیدا کرتے وقت میں نے انہیں بلالیا تھا اور نہ خود ان کی پیدائش کے وقت (اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اور میں گمراہ کن لوگوں کو اپنا دست و بازو بناتا یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

جب یہ صورت ہے تو ڈارون کے پیروکار محض ظن وتخمین کے پیچھے چل رہے ہیں:

"اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔"

(سورۂ النجم:۲۸)

ترجمہ:..... "وہ محض اٹکل پر چل رہے ہیں، جب کہ حق کے مقابلہ میں اٹکل پچو کچھ بھی کام نہیں دے سکتی۔"

تو انہیں چاہئے کہ ظنون واوہام کو چھوڑیں اور حق کا اتباع کریں۔

ہم دیانت داری کا تقاضا سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کا برملا اظہار کردیں کہ نظریہ ارتقاء کی تائید میں ڈاکٹر صاحب اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ بعض دوسری دراز قامت شخصیتیں بھی ان کی ہم نوا ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کے علم وفضل میں کس کو کلام ہے؟ انہوں نے ابن مسکویہ کی "الفوز الاصغر" سے عربی عبارات نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ڈارون

اس نظریہ کا بانی اور موجد نہیں ہے۔ صدیوں پہلے یہ نظریہ پیش کیا جاچکا تھا۔ ایک دوسرے بزرگ نے اپنی تفسیر میں اس مسئلہ کو جگہ دی اور کافی شدّ و مد سے اس کو بیان کیا، لیکن ہم گنہگاروں کی وہی ایک بات:

"ایتونی بشیٔ من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتیٰ اقول بہ"

جس چیز کی تائید، اللہ کے قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے نہیں ہوتی، بلکہ تردید ہوتی ہے، وہ دیوار میں دے مارنے کے قابل ہے۔ فاضربوہ بالحائط۔ ہمیں امام عالی مقام سیدنا ابوحنیفہؒ کا یہ فرمان بھی یاد ہے: "اترکوا قولی بخبر رسول اللہ ﷺ"۔

مخالف حدیث ہونے کی صورت میں حضرۃ الامام کا قول چھوڑ دیا جائے گا۔ بیچارے ابن مسکویہ یا ڈارون کون ہوتے ہیں؟ ھذا ما اعتقدنا، و اللہ نسأل حسن الخاتم۔ جہاں تک ان بزرگوں کا تعلق ہے، ہم ان کے بارے میں کسی سوءِ ظن یا بدزبانی کے قطعاً روادار نہیں۔ اپنے علم کی رو سے وہ حضرات، ہمارے قلبی احترام کے مستحق ہیں، مگر سیدنا فاروق اعظمؓ کے اس فرمان سے چشم پوشی نہیں کرسکتے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

تین چیزیں، اسلام کی رونق کو پامال کرتی ہیں: عالم کی لغزش، منافق کی کج بحثی اور گمراہ کن فرماں رواؤں کا اقتدار۔ اعاذنا اللہ من شرھا۔

تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

(سورۃ الانعام:۱۱۵)

کیا زیورات پر زکوٰۃ لازم آتی ہے؟

خطبہ نمبر ۱۱ کے آخر میں سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو جناب ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کیا گیا کہ استعمال میں آنے والے سونے چاندی کے زیورات پر زکوٰۃ دینی ہوگی یا نہیں؟ تو اس کا جواب آپ نے اس طرح دیا:

''ہمارے فقہاء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ عورت کے استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نہیں، اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ سوائے اس کے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہر شخص اپنے امام کے احکام پر عمل کرے۔''

اولاً: ہمیں اس پر حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے دو اماموں کی رائیں تو نقل کردیں، مگر انہوں نے یہ زحمت گوارا نہ فرمائی کہ تھوڑا سا حدیث کی طرف بھی رخ فرمالیتے اور جیسا کہ ان کی عادت مبارک ہے کہ اکثر و بیشتر وہ اپنے علمی جوابات کو احادیث کے حوالوں سے مزین فرماتے ہیں، یہاں بھی فرمادیتے کہ احادیث سے اس سوال کا کیا جواب ملتا ہے۔

ثانیاً: وہ امام شافعیؒ کا مسلک حتمی شکل میں نقل فرماتے ہیں، حالانکہ صحیح صورت یوں نہیں۔ قارئین سطور ذیل کو ملاحظہ فرمائیں گے تو بات واضح ہوجائے گی۔

ثالثاً: ڈاکٹر صاحب نے اس چیز کو بھی نظر انداز فرمادیا کہ وہ پاکستان میں کھڑے ہوکر جواب دے رہے تھے، جہاں کی ۹۸٪ سنّی آبادی حضرت امام ابوحنیفہؒ کی

پیروکار ہے۔ کم از کم اس خطہ میں حضرت امام شافعیؒ کے پیروکار نہیں ہیں..... اب چند احادیث سنئے:

حدیث نمبر۱: ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی، اس کے ساتھ اس کی ایک بیٹی تھی۔ اس بچی کے ہاتھ میں سونے کے دو موٹے موٹے کنگن تھے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا اس کی زکوٰۃ دیا کرتی ہو؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: تو کیا تم پسند کرتی ہو کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے بدلے تمہیں آگ کے کنگن پہنا دے؟ راوی کا بیان ہے کہ یہ سن کر اس نے وہ کنگن اتار لئے اور حضور ﷺ کے سامنے ڈال دیئے اور کہا: "هما لله و رسوله"۔ (سنن ابی داؤد ج:۱ ص:۲۲۵، سنن نسائی ج:۱ ص:۳۴۳)

واضح رہے کہ ابن قطان، حافظ منذری، ابن حجر عسقلانی، ابن ہمام، علامہ زیلعی، امیر یمانی اور صاحب تحفۃ الاحوذی نے ابو داؤد کی روایت کو سنداً بالکل صحیح اور بے غبار قرار دیا ہے۔

حدیث نمبر۲: ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں سونے کا کوئی زیور پہنے ہوئے تھی، میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: حضور! کیا یہ بھی "کنز" کی فہرست میں آتے ہیں (کنز سے مراد سونے چاندی کا وہ گنجینہ ہے جس کے جمع کرنے پر قرآن شریف میں عذاب الیم کی وعید آئی ہے کہ تپا تپا کر اس سے ماتھوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا) تو آپؐ نے فرمایا: جو زیور، زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو وہ کنز نہیں رہ جاتا۔

(ابوداؤد شریف ج:۱ ص:۲۲۵، دارقطنی وغیرہ)

حدیث نمبر۳: ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ

ﷺ میرے ہاں تشریف لائے اور آپؐ نے میرے ہاتھ میں چاندی کے زیور دیکھے۔ پوچھا: عائشہ! یہ زیور کیسے ہیں؟ میں نے عرض کیا: میں نے یہ آراستگی کے لئے بنوائے ہیں۔ فرمایا: کیا اس کی زکوٰۃ دیا کروگی؟ میں نے کہا: نہیں۔ یا یوں کہا: جیسا اللہ کو منظور ہوگا، دیکھا جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا: "ھو حسبک من النار" یعنی اگر زکوٰۃ نہیں دوگی تو عذاب دوزخ کے لئے یہی کافی ہے۔ (ابوداؤد شریف ج:۱ ص:۲۲۵)

حدیث نمبر۴: اسماءؓ بنت یزید (ایک صحابیہ کا نام ہے) کہتی ہیں میں اور میری خالہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ہم نے سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھے۔ آپؐ نے پوچھا: کیا تم ان کی زکوٰۃ دیا کرتی ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ فرمایا: تم ڈرتی نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آگ کے کنگن پہنادیں۔ "ادیا زکوتھما"۔ ان کی زکوٰۃ دیا کرو۔ (مسند احمد ج:۶ ص:۴۵۹)

حدیث نمبر۵: فاطمہؓ بنت قیس کہتی ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آئی اور میں نے ستر مثقال (لگ بھگ ۲۲ تولے) کا ایک گلے کا زیور پہن رکھا تھا۔ میں نے عرض کیا: حضورؐ! اس میں سے زکوٰۃ لے لیجئے تو آپ نے 13/4 مثقال لے لئے۔ (دارقطنی)

حدیث نمبر۶: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا: حضورؐ! میری بیوی کا بیس مثقال (71/2) وزن کا طلائی زیور ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا: نصف مثقال زکوٰۃ دو۔ (دارقطنی)۔

یہ روایات ہم نے صحاح کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ (اہل حدیث) کی کتاب تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ج:۲ ص:۱۱ سے نقل کی ہیں۔ موصوف ان

روایات کو نقل کرنے سے پہلے لکھتے ہیں:

"قلت، القول بوجوب الزكوٰة فی حلی الذهب و الفضة هو الظاهر الراجح عندی"۔

ترجمہ: سونے چاندی کے زیورات میں زکوٰۃ لازم ہونے کا قول ہی میرے نزدیک ظاہر اور راجح ہے۔

حدیث نمبر ۷: حضرت انسؓ کو خلیفہ اوّل حضرت صدیق اکبرؓ نے بحرین کا حاکم بنا کر روانہ فرمایا تو زکوٰۃ کے بارے میں ایک لمبی تحریر لکھوا کر دی جس کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا:

"هذه فريضة الصدقة التی فرض رسول الله ﷺ علی المسلمين و التی امر الله بها رسوله."

اس تحریر کے اخیر میں ہے: و فی الرقة ربع العشر. یعنی چاندی میں چالیسوں حصہ لازم ہے۔ (بخاری ج:۱ ص:۱۹۶)

اب اس میں اس بات کی کوئی تخصیص نہیں ہے کہ وہ چاندی ٹکڑے کی شکل میں ہو، نقد رقم ہو۔ بلکہ عام حکم دیا گیا ہے۔ اسی لئے علماءؒ نے تصریح کی ہے کہ الفاظ کا عموم زیورات میں زکوٰۃ کے فرض ہونے کی دلیل ہے۔ محض قیاس کی بناء پر اس میں تخصیص پیدا کرنا اور زیورات کو اس حکم سے مستثنیٰ کر لینا صحیح نہیں ہے۔

ان احادیث مرفوعہ کے علاوہ کافی تعداد میں آثار صحابہ موجود ہیں، جن کے نقل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ایک بھی صحیح روایت پیش نہیں کی جاسکتی، جس سے زیورات میں زکوٰۃ کا لازم نہ ہونا ثابت ہو۔ احادیث و آثار کی اس

کثرت کو دیکھ کر امام فخر الدین رازیؒ کو یہ کہنا پڑا، حالانکہ وہ شافعی المسلک ہیں :

"الصحیح عندنا وجوب الزکوٰۃ فی الحلی"

(تفسیر کبیر ج:۱۵ ص:۴۶)

ترجمہ :....."ہمارے (شافعیہ کے) نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ زیورات میں زکوٰۃ لازم ہوتی ہے۔

اور علامہ خطابیؒ نے کہا : "الظاھر من الکتاب یشھد بقول من اوجبھا و الاثر یؤیدہ"۔

ترجمہ:....." کتاب اللہ سے جو کچھ ظاہر ہے، وہ ان لوگوں کے قول کی تائید کرتا ہے جو زیورات میں زکوٰۃ کو لازم قرار دیتے ہیں۔ اور حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

علامہ ابن الھمامؒ، مختلف کتب حدیث سے متعدد احادیث و آثار صحابہ و تابعین نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

ترجمہ:..... " مخالفین سے تاویلات منقول ہیں، وہ تو اس قابل نہیں ہیں کہ دل میں لائی جائیں، اور ان کی طرف توجہ کی جائے اور روایات کے بعض الفاظ صراحتاً انہیں رد کرتے ہیں۔ و اللہ سبحانہ اعلم۔ (فتح القدیر ج:۱ ص:۵۲۶)

کیا زکوٰۃ سے مسجد تعمیر کرائی جاسکتی ہے؟

اسی خطبہ نمبر۱۱ میں ڈاکٹر صاحب مصارف زکوٰۃ کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں:

''فی سبیل اللہ'' کے تحت پوری ملٹری ایڈمنسٹریشن آجاتی ہے۔ سپاہیوں کی تنخواہوں کی ادائیگی، اسلحہ کی فراہمی اور دیگر فوجی ضروریات سب اس کے تحت آجاتی ہیں۔ نیز اور چیزیں بھی مثلاً مسجدوں کا بنانا، کارواں سرائے تعمیر کرنا، مدرسوں کی تعمیر وغیرہ یہ ساری چیزیں فی سبیل اللہ کے تحت آجاتی ہیں''۔

(خطبات ص:۳۷۴)

''میری رائے میں ''فی سبیل اللہ'' کی رقم سے مسجد بن سکتی ہے اور زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کی مد بھی ہے''۔

(خطبات ص:۳۹۱ بجواب سوال نمبر۱۷)

اصل مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے تمہیداً دو باتیں سن لیجئے۔

پہلی گزارش:

امام مسلمؒ اپنی نامور کتاب کے آغاز میں رُوَاۃِ حدیث میں فرقِ مراتب پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فلا یقصر بالرجل العالی القدر عن درجته و لا یرفع متضع القدر فی العم فوق منزلته و یعطی کل

ذی حق حقه، و ینزل منزلته و قد ذکر عن عائشة رضی الله عنها انها قالت امرنا رسول الله ﷺ ان ننزل الناس منازلهم." (مسلم شریف ص:۴)

ترجمہ:..... "جو شخص علم میں بلند مرتبت ہو، اس کے حق میں کوتاہی نہ کرے اور جو کم درجے کا ہو اسے اس کی حیثیت سے نہ بڑھائے۔ ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرے اور اسے اس کے شایان شان مرتبے میں رکھے۔ حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ "ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہم لوگوں کو ان کی حیثیت کے مطابق، مقام دیں۔"

آنحضرت ﷺ کی ایک پیشگوئی کے مطابق بدقسمتی سے آج عالم یہ ہے کہ علم دین، کساد بازاری کا شکار ہے۔ علماً تو کم پیدا ہو رہے ہیں البتہ "مجتہد" بڑھ رہے ہیں۔ عنایت اللہ مشرقی، نیاز فتح پوری اور غلام احمد پرویز جیسے جاہلوں کو جب "علامہ" کہا جانے لگا تو پھر وہ اہل علم، جنہوں نے باقاعدہ عربی علوم وفنون کی تعلیم بھی حاصل کر لی ہو، وہ اگر "میرے نزدیک، میرے خیال میں اور میں یہ کہتا ہوں" کا سہارا لے کر میدانِ اجتہاد میں اتر آئیں تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ یہ خوف خدا تو سلف صالحین میں تھا کہ اصمعی جیسے ادب عربی کے امام سے قرآن پاک کی کسی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی تو جواب دیتے کہ عربی زبان کے الفاظ کی حیثیت سے تو ان کے معنیٰ یہ ہیں، اللہ نے اپنے کلام میں کیا مراد لیا ہے، یہ میں نہیں بتا سکتا..... بہر صورت اب یہ قارئین کی ذمہ داری ہے کہ اگر آج کوئی اسکالر یا عالم فاضل، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور دیگر جلیل القدر ائمۂ دین کے مقابلے میں کوئی بات کہتا

ہے، تو وہ فیصلہ کرلیں کہ کس کی بات قابل قبول ہوگی اور کس کو فوقیت دی جائے گی۔

دوسری گزارش:

امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ، جن کے ہم پلہ، شاید برصغیر کی سرزمین نے کوئی سپوت نہیں جنا، اپنی کتاب فیوض الحرمین میں تحریر فرماتے ہیں کہ تین باتوں کی طرف میری طبیعت سختی سے مائل تھی، مگر قیام حرمین شریفین کے دوران میری مرضی اور طبیعت کے برخلاف، رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ارشاد ہوئے۔ ان میں سے ایک کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

"و ثانیها الوصاة بالتقید بهذه المذاهب الاربعة لا اخرج منها و التوفیق ما استطعت و جبلتی تابی التقلید و تانف منه راساً و لکن شئ طلب منی التعبد به بخلاف نفسی."

(فیوض الحرمین مترجم مطبوعہ دہلی ص:۶۴)

ترجمہ:..... "دوسری چیز یہ ہے کہ مجھے ان چاروں فقہی مذاہب کا پابند رہنے کا حکم دیا گیا کہ میں ان سے باہر نہ جاؤں اور جہاں تک ہوسکے ان میں موافقت پیدا کروں، حالانکہ میری طبیعت، تقلید کو قبول نہیں کرتی اور اس سے گریز کرتی ہے، لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے کہ میرے مزاج کے خلاف مجھ سے اس کی تعمیل کے لئے فرمایا گیا۔"

جو لوگ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علمی پایہ سے واقف ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں

کہ وہ مرتبۂ اجتہاد کے حامل تھے، اس کے باوجود انہیں بارگاہ نبوت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے چاروں فقہی مذاہب کے اندر رہنے کا حکم ہوا اور ان سے باہر جانے کی رکاوٹ فرمادی گئی۔ جب امام الہند کا یہ حال ہے تو ما وشما کی کیا حیثیت ہے کہ ان ائمہ کے بالمقابل اپنے اجتہاد کی ٹکسال کھول لیں۔ لیکن برا ہو اس شوق اجتہاد کا کہ ایسے بے علم، جو چار سطر عربی عبارت کا صحیح ترجمہ نہیں کرسکتے وہ بھی اجتہاد فرمانے لگتے ہیں۔ (رئیس احمد جعفری مرحوم نے علامہ ابن قیمؒ کی کتاب ''زاد المعاد'' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو نفیس اکیڈمی کراچی نے چھاپا تھا۔ ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کا کوئی سا صفحہ لے لو اس میں چار پانچ غلطیاں تو ضرور ہی نکل آئیں گی۔ اس کے باوجود ان کے دل میں بھی شوق اجتہاد گدگدیاں لیتا تھا، اور حضرت کہیں کہیں اپنے اس شوق کی تکمیل فرمالیتے تھے..... اس سلسلہ کے ایک اور بزرگ ڈاکٹر صغیر حسن معصومی صاحب ہیں جو ہمارے ملک کے مشہور اسکالر ہیں۔ انہوں نے علامہ حامد عمادی دمشقی کے رسالہ: ''الصلاۃ الفاخرۃ بالاحادیث المتواترۃ'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ میں بھی غلطیوں کی بھرمار ہے۔ عرصہ ہوا میں نے اس بارے میں انہیں توجہ دلائی تھی، مگر پھر کیا ہوا، ان کی طرف سے خط کی رسید ہمیں بے شک مل گئی، آگے کا کچھ پتا نہیں)۔

قارئین یہ نہ خیال کریں کہ ہم دور حاضر میں اجتہاد کا دروازہ مطلقاً بند کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ بیسیوں ایسے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا صریح جواب علمائے سلف کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس صورت میں بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ متبحر علمائے مل بیٹھ کر کتاب وسنت اور فقہ قدیم کی روشنی میں ان کا حل تلاش کریں، لیکن ہر کہ مہ کو اس کا حق دے دیا جائے، اس سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

آمدیم برسر مطلب :

اب ہم زیر بحث مسئلہ کو لیتے ہیں۔ سب سے پہلے قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مصارف زکوٰۃ، خود قرآن مجید میں ارشاد فرمادیئے گئے ہیں۔ کل مصارف آٹھ بتائے گئے ہیں۔ (دیکھئے سورہ توبہ : آیت :۶۰) آیت کے شروع میں لفظ انما آیا ہے، جو کلمۂ حصر ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ زکوٰۃ صرف انہی مدات میں تقسیم کی جاسکتی ہے، ان سے باہر نہیں۔ حدیث کی مشہور کتاب ابوداؤد شریف میں ایک واقعہ درج ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے مال زکوٰۃ میں سے کچھ مانگا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا:

"ان الله لم يرض بحكم نبى و لا غيره فى الصدقات حتىٰ حكم هو فيها فجزأها ثمانية اجزاء. فان كنت من تلك الاجزاء اعطيتك۔"

(ابوداؤد ج:۱ ص:۲۳۷)

ترجمہ:..... "اللہ نے اموال زکوٰۃ کی تقسیم میں نہ نبی کا فیصلہ پسند کیا، نہ کسی اور کا، حتیٰ کہ اس نے خود ہی فیصلہ کردیا کہ اسے آٹھ حصوں میں تقسیم کردیا۔ اگر تم ان میں سے ہوگے تو تمہیں مل جائے گا....."

یہ حدیث اس بارے میں نص صریح ہے کہ مصارف زکوٰۃ جو شریعت نے مقرر کردیئے ہیں، وہی رہیں گے۔ ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی ایسا کرنے کی سعی کرے گا، تو اس کی یہ سعی نامشکور ہوگی۔

فی سبیل اللہ کا مصداق:

قرآن پاک میں مصارف زکوٰۃ کے ضمن میں ساتواں مصرف فرمایا گیا ہے: فی سبیل اللہ۔ اس لفظ سے کیا مراد ہے؟ تو تمام مشہور کتب تفسیر، شروح حدیث اور کتب فقہ میں اس کی تفسیر غازی اور مجاہد سے کی گئی ہے، البتہ بعض ائمہ نے ضرورت مند حاجی کو بھی اس کے مصداق میں شامل کیا ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے مشہور مالکی عالم ابن رشد اندلسیؒ فرماتے ہیں:

"و اما سبیل الله ، فقال مالک : سبیل الله مواضع الجهاد و الرباط. و به قال ابوحنیفه. و قال غیره الحجاج و العمار. و قال الشافعی: هو الغازی جار الصدقة." (بدایة المجتهد ج:۱ ص:۳۲۵)

شیخ عبدالرحمٰن جزیری نے زیادہ بسط سے لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"الحنفیة قالوا : و فی سبیل الله هم الفقراء المنقطعون للغزو فی سبیل الله علی الاصح....."

ترجمہ:..... "احناف کہتے ہیں: فی سبیل اللہ سے مراد وہ غریب لوگ ہیں جو اللہ کے راستے میں جہاد کے وسائل نہیں رکھتے، زیادہ صحیح یہی بات ہے۔"

"و لا یجوز ان یصرف الزکوٰة فی بناء مسجد او مدرسة....."

ترجمہ:..... "اور زکوٰۃ کا مسجد یا مدرسے کی تعمیر میں لگانا

جائز نہیں ہے.....''

''المالکیة قالوا : و المجاهد یعطی من الزکوٰة ان کان حرًّا مسلماً غیر هاشمی، و لو غنیاً.''

ترجمہ:.....'' مالکیہ کہتے ہیں کہ مجاہد کو زکوٰۃ میں سے دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ آزاد ہو، مسلمان ہو، ہاشمی نہ ہو، خواہ وہ مالدار بھی ہو۔''

''الحنابلة قالوا : و فی سبیل الله هو الغازی ان لم یکن هناک دیوان ینفق منه علیه.''

ترجمہ:.....'' حنابلہ کہتے ہیں: فی سبیل اللہ کا مصداق غازی ہے بشرطیکہ سرکاری طور پر اسے کوئی معاوضہ نہ ملتا ہو۔''

''الشافعیة قالوا : هو المجاهد المتطوع للغزو و لیس له نصیب من المخصصات للغزاة فی الدیوان.''

ترجمہ:.....'' شافعیہ کہتے ہیں: وہ مجاہد مراد ہے جو جہاد کے لئے محض ثواب کی نیت سے جانا چاہتا ہو اور سرکاری طور پر مجاہدین کے لئے جو کچھ مقرر ہو، اس میں اس کا کوئی حصہ مقرر نہ ہو۔''

(کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ج:۱ ص:۵۶۳تا۵۶۶)

شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانیؒ (شافعی المسلک) فرماتے ہیں:

''و اما سبیل الله فالاکثر علی انه یختص بالغازی غنیًّا کان او فقیراً الا ان اباحنیفة قال : یختص

بالغازی المحتاج. و عن احمد و اسحق، الحج من سبیل الله." (فتح الباری ج:۳ ص:۳۳۲)

ترجمہ:....."سبیل اللہ کے بارے میں زیادہ تر علماً یہی کہتے ہیں کہ یہ لفظ مجاہد کے لئے مختص ہے خواہ وہ مالدار ہو، خواہ غریب، مگر امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مجاہد جو حاجت مند ہو، اس کے لئے مختص ہے۔ امام احمد اور اسحٰق سے منقول ہے کہ حج بھی سبیل اللہ میں شامل ہے۔"

حضرت امام غزالیؒ اپنی شہرۂ آفاق کتاب احیاء العلوم میں فرماتے ہیں:

"الصنف السابع، الغزاة"۔ (احیاء ج:۱ ص:۲۲۲)

یہاں پر ہم نے قصداً فقہاء احناف کی عبارتیں نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے، ورنہ تو ان حضرات کی تصنیفات سے بیسیوں حوالے دیئے جاسکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علماء امت کی تصریحات سے قطع نظر، ہم جب کتاب وسنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو بات یہیں واضح ہوجاتی ہے اور ہم یہ ماننے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ مصارف زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کا لفظ ایک شرعی اصطلاح ہونے کی حیثیت سے آیا ہے۔ مصارف والی آیت سورۂ توبہ میں آئی ہے اور اسی سورت میں آگے پیچھے جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، جہاد اور قتال ہی کے سلسلہ میں آیا ہے۔ چنانچہ آیات ذیل دیکھئے:

۱:....."اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ." (آیت:۲۰)

۲:....."اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ." (آیت:۲۴)

۳:....."مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ." (آیت:۳۸)

۴:.....آیت نمبر ۶۰ یہی ہے جس میں مصارف زکوٰۃ کی تفصیل ہے۔

۵:....."كَرِهُوْا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ." (آیت:۸۱)

۶:....."يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ." (آیت:۱۱۱)

۷:....."ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَأٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ." (آیت:۱۲۰)

سوال یہ ہے کہ سورۂ توبہ میں آگے پیچھے ہر جگہ فی سبیل اللہ، جہاد کے تعلق سے استعمال ہوا ہے، مصارف زکوٰۃ میں اس کا مصداق کیونکر بدل جائے گا؟

دوسرے مقامات کو دیکھا جائے تو وہاں بھی فی سبیل اللہ کا لفظ زیادہ تر جہاد ہی کی مناسبت سے استعمال ہوا ہے۔ سورۂ توبہ سے پیچھے سورۂ انفال ہے جو اپنے مضامین کے اعتبار سے سورۂ توبہ سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں قوانین جنگ کا ذکر ہے اور اس میں اعلان جنگ ہے۔ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۶۰ میں تیاری جہاد کا حکم آیا ہے اور اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے:

"وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ." (انفال:۶۰)

اب اللہ کی کتاب کے بعد حدیث شریف کی طرف آیئے۔ صحیح بخاری کی کتاب الجہاد کے کم و بیش سترہ ابواب کے عنوانات میں فی سبیل اللہ کا لفظ آیا ہے۔

آیئے ایک طائرانہ نظران پر ڈال لیجئے تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ حدیث شریف میں یہ لفظ کس موقع محل پر استعمال ہوتا ہے؟

(۱) افضل الناس مؤمن و مجاهد فی سبیل اللّٰه۔ (۲) درجات المجاهدین فی سبیل اللّٰه۔ (۳) الغدوة و الروحة فی سبیل اللّٰه۔ (۴) فضل من یصرع فی سبیل اللّٰه۔ (۵) من ینکب فی سبیل اللّٰه۔ (۶) من یُجْرَحُ فی سبیل اللّٰه۔ (۷) من اغبرت قدماه فی سبیل اللّٰه۔ (۸) مسح الغبار عن الرأس فی سبیل اللّٰه۔ (۹) فضل قول اللّٰه وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (۱۰) قول اللّٰه لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِینَ وَ الْمُجَاهِدُونَ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ۔ (۱۱) فضل الصوم فی سبیل اللّٰه۔ (۱۲) فضل النفقة فی سبیل اللّٰه۔ (۱۳) من احتبس فرساً فی سبیل اللّٰه۔ (۱۴) الحراسة فی الغزو فی سبیل اللّٰه۔ (۱۵) فضل رباط یوم فی سبیل اللّٰه۔ (۱۶) الجعائل و الحملان فی سبیل اللّٰه۔ (۱۷) وجوب النفیر..... و قوله وَ جَاهِدُوا بِاَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ فِی سَبِیلِ اللّٰه۔

اب حدیث کی ایک اور کتاب ترمذی شریف ہاتھ میں لیتے ہیں، اس میں جہاد کے متعلق مباحث میں ایک درجن ابواب کے عنوانات میں فی سبیل اللہ کا لفظ آیا ہے۔ ان کے علاوہ کئی ایک دوسرے ابواب میں بھی درج شدہ احادیث میں فی سبیل اللہ کا لفظ آیا ہے۔ یہ تمام احادیث جہاد سے تعلق رکھتی ہیں۔ محدثین حضرات کا اس کثرت سے جہاد کے مباحث میں فی سبیل اللہ کا لفظ لے آنا فقہاً کرام کے اس موقف کی دلیل ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں ساتویں مصرف فی سبیل اللہ سے مراد غازی اور مجاہد ہے۔ اسی لئے علامہ ابن الجوزی نے کہا: ''اذا اطلق ذکر سبیل اللّٰه فالمراد به

الجهاد۔" (فتح الباری ج:٦ ص:۴۸)

اور شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

"المتبادر عند الاطلاق من لفظ سبیل اللّٰہ الجهاد." (فتح الباری ج:٦ ص:۲۹)

ترجمہ:..... "یعنی جب سبیل اللہ کا لفظ مطلق آئے تو ذہن میں فوری طور پر اس کا معنیٰ جہاد ہی آتا ہے۔"

ان قرآنی اور حدیثی اطلاقات اور محدثین وفقہاءؒ کی تصریحات کے بعد اس بات میں کوئی تردُّد باقی نہیں رہ جاتا کہ مصارف زکوٰۃ میں ساتواں مصرف مجاہدین اور غازی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ امام محمد اور امام احمد نے حُجّاج کو بھی فی سبیل اللہ کے مصداق میں شامل کیا ہے، اس لئے کہ بعض صحابۂ کرام سے منقولہ روایات اور آثار میں ایسا آیا ہے، چنانچہ حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے: "ان الحج من سبیل اللہ۔" حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی ایک روایت آئی ہے۔ اس سے زیادہ تعمیم وتوسیع نہ حضرات صحابہؓ سے منقول ہے نہ ائمۂ دین فقہاءؒ ومحدثین سے۔

علماءِ متأخرین میں بعض نے کچھ توسیع سے کام لیا ہے۔ چنانچہ امام رازی لفظ فی سبیل اللہ کی تفسیر الغزاۃ سے کرنے کے بعد لکھتے ہیں: (عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو)

"قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاءؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے نیکی کی تمام صورتوں میں صدقات خرچ کرنے کی اجازت دی ہے، مثلاً مردوں کو کفن دینا، حفاظتی قلعے بنانا اور مسجدیں تعمیر کرنا، اس لئے وفی سبیل اللہ کا لفظ عام ہے اور ان تمام صورتوں کو شامل ہے۔" (تفسیر کبیر ج:١٦ ص:۱۱۳)

''قفال'' کون بزرگ ہیں اور بعض فقہاء سے مراد کون سے حضرات ہیں؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ ہم اتنا عرض کئے دیتے ہیں کہ یہ قول اس حد تک کمزور ہے کہ بیشتر مفسرین حضرات نے تو اسے اس قابل ہی قرار نہیں دیا کہ وہ اپنی کتابوں میں اسے جگہ دیتے، دیکھئے تفسیر ابن کثیر، بغوی وغیرہ۔ تفسیر خازن کے مصنف نے کسی کا نام لئے بغیر یہ قول نقل کیا ہے، لیکن ساتھ ہی فرمادیا ہے:

''و القول الاول هو الصحيح، لاجماع الجمهور عليه.''

''یعنی پہلا قول (کہ فی سبیل اللہ سے مراد غازی ہیں) ہی صحیح ہے کیونکہ جمہور علماء اس پر متفق ہیں۔''

ہاں اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر فی سبیل اللہ میں ہر قسم کے مصارف خیر شامل ہیں تو پھر مصارف زکوٰۃ کے سلسلہ میں قرآن پاک میں باقی سات مدات ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ فقراء و مساکین، غلام، نادار مسافر وغیرہ سب فی سبیل اللہ میں آجاتے۔ تو پھر علیحدہ علیحدہ ان کو بیان کرنے کا کیا مطلب؟

ایک مغالطہ اور اس کا جواب:

جن حضرات نے کچھ تعمیم اور توسیع سے کام لیا ہے انہیں دراصل دھوکہ یہاں سے لگا ہے کہ فی سبیل اللہ کا لفظ اپنے لغوی معنیٰ کے لحاظ سے نیکی کی تمام ممکنہ صورتوں کو شامل ہے حالانکہ ہر جگہ لغت کام نہیں دیتی۔ تمام کتب تفسیر اور صحیح بخاری (ج:۲ ص:۶۴۷) وغیرہ میں ایک واقعہ درج ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ''كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ۔'' (یعنی تم اس

وقت تک کھاتے رہو کہ سفید تاگہ، سیاہ تاگہ سے واضح ہوجائے) تو حضرات صحابہؓ میں سے کئی لوگوں نے اپنے پاؤں میں دو تاگے باندھ لئے تھے ایک سفید اور ایک سیاہ۔ حضرت عدی بن حاتمؓ نے بھی اپنے پاس دو دھاگے رکھ لئے۔ انہوں نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہوکر عرض کیا تو آنحضرت ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ ان تاگوں سے مراد دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی ہے۔ اسی طرح دیکھا جائے تو الصلوٰۃ ، الزکوٰۃ، الصوم، الحج وغیرہ تمام شرعی اصطلاحات کا یہی حال ہے کہ اپنے لغوی معنوں میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اگر آپ ہر جگہ لغت کو لے کر بیٹھیں گے تو کئی خرابیاں لازم آئیں گی مثلاً:

قرآن کو مخلوق ماننا پڑے گا، اس لئے کہ قرآن ایک شے ہے اور ادھر فرمایا گیا ہے: ''خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ'' جب آپ ایک طرف پڑھیں گے : ''يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ'' اور دوسری طرف پڑھیں گے : ''كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ'' تو اب آپ کی لغت دانی کیا کہے گی؟

ایک اور سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے، کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ کھٹک پیدا ہو کہ فقہاءِ احناف میں سے ایک بلند پایہ عالم، ملک العلماء کاسانیؒ نے اپنی کتاب بدائع میں تعمیم اور توسیع سے کام لیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''و اما قوله تعالیٰ و فی سبیل اللّٰه عبارة عن جمیع القرب فیدخل فیه کل من سعیٰ فی طاعة الله و سبیل الخیرات اذا کان محتاجاً.'' (بدائع ج:۲ ص:۴۵)

ترجمہ:..... ''فی سبیل اللہ میں تمام نیکی کے کام شامل

ہیں۔ اس لئے جو شخص بھی اللہ کی اطاعت اور نیکی کے راستے میں
کوشاں ہو، وہ اس میں آجاتا ہے، بشرطیکہ وہ محتاج ہو۔"

کئی لوگوں کو اس عبارت سے دھوکہ لگا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ کاسانی نے آخر میں جو محتاج ہونے کی شرط لگادی ہے، اس نے اس دھوکہ کا بالکل ازالہ کردیا ہے کیونکہ اس شرط کی وجہ سے اس شخص کے مستحق ہونے کا موجب پھر وہی فقیر اور مسکین ہونا ٹھہرا اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ زکوٰۃ کا مصرف وہ نادار آدمی ہے جو کسی کار خیر میں رقم کو خرچ کرتا ہے، نہ کہ کار خیر خود۔ لہٰذا مسجد، مدرسہ، دار الاقامہ، مسافر خانہ، کوئی حفاظتی قلعہ یا پُل وغیرہ براہ راست زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہوسکتے۔

حد ہوگئی : اسلاف میں سے اگر کسی نے کچھ تعمیم کی بھی ہے تو پھر بھی کچھ پابندیاں عائد کردیں، مگر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے تو حد کردی ہے کہ وہ پوری سِول (ڈاکٹر صاحب سول ایڈمنسٹریشن کو العاملین کے تحت اور ملٹری ایڈمنسٹریشن کو فی سبیل اللہ کے تحت زکوٰۃ کے مصرف قرار دیتے ہیں۔ دیگر تعمیری کاموں کو بھی اسی مؤخر الذکر میں شامل کرتے ہیں) ایڈمنسٹریشن، ملٹری اور ملکی تعمیر و ترقی کے تمام اخراجات زکوٰۃ میں سے ادا کرنے کا فتویٰ دیتے ہیں : ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

ہمیں حیرت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانِ گرامی، جو متعدد احادیث میں آیا ہے :

"تُؤخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَ تُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ"

(ابوداؤد ج:۱ ص:۲۳۰)

ترجمہ:..... "کہ زکوٰۃ مال داروں سے لے کر وہاں کے
نادار اور محتاج لوگوں میں تقسیم کردی جائے"

اس کا کیا ہوگا؟ ہم صرف ایک درخواست کرتے ہیں:

"اِئْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثٰرَةٍ مِنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ" (الاحقاف:۴)

اگر آپ لوگ سچے ہیں تو اس سے پہلے کی کسی کتاب کا حوالہ یا اور کوئی علمی دلیل لے آئیں۔

ایک طالب علمانہ سوال اور اس کا جواب:

یہاں پر ایک طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ اپنی گزارشات کو ختم کرنے سے پہلے وہ سوال مع جواب حوالہ قلم کردیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر فی سبیل اللہ کا مصداق مجاہدین ہیں اور مجاہدین بھی وہ جو محتاج اور ضرورت مند ہوں تو پھر تو فقراء کی مد میں وہ بھی آگئے۔ علیحدہ مد نمبر ۷ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس کا جواب عنایہ شرح ھدایہ سے نقل کرتے ہیں، ترجمہ ملاحظہ ہو:

"جواب یہ ہے کہ جو غازی (مجاہد) ضرورت مند ہے اور سفر خرچ یا سامان جہاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ رکا ہوا ہے، بے شک وہ بھی فقیر ہے، لیکن اس کی خاص نوعیت ہے، وہ اپنی بود و باش میں امداد کا محتاج نہیں ہے، بلکہ ایک ملّی فریضہ کو سرانجام دینے کے لئے ضرورت مند ہے، اس لئے مصارف زکوٰۃ میں اسے ایک مستقل مد قرار دیا گیا ہے۔ گویا فقیر کو اس کی ذاتی ضروریات کی وجہ سے زکوٰۃ کا مستحق قرار دیا گیا اور غازی کو اجتماعی اور قومی ضرورت کی بنا پر۔"

اعضاء کی پیوند کاری

اسی خطبہ نمبر ۱۱ میں ایک سوال جو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا، مع جواب درج ذیل ہے:

"سوال نمبر ۱۳: اسلامی نقطۂ نظر سے انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے آنکھوں، خون اور دیگر اعضائے جسمانی کا عطیہ دینا جائز ہے یا نہیں۔ اسی طرح کسی دوسرے شخص کی آنکھ یا دل وغیرہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس بارے میں آپ کو نہ قرآن میں کوئی ذکر ملے گا، نہ حدیث میں اور نہ ہی ہمارے فقہاء کی کتابوں میں۔ یہ چیز علم طب کی جدید ترین ترقی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے۔ اس بارے میں کوئی اجماع ابھی تک نہیں ہوسکا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اور فقہاء کی کیا رائے ہے۔ میں اپنی ذاتی رائے عرض کرسکتا ہوں، ممکن ہے اوروں کو اس سے اتفاق ہو، ممکن ہے وہ اسے رد کردیں۔ ایک زندہ کی جان بچانے کے لئے ایک مردہ کی ذات سے استفادہ کیا جائے تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اس طرح ایک انسان کی فالتو چیزوں سے دوسرے انسان کا فائدہ ہوتا ہو، تو اس کی اجازت سے ہم استعمال کرسکتے ہیں۔ ان حالات میں فرض کیجئے کہ ایک آدمی مرجاتا ہے اور فوراً ہی اس کی

آنکھوں کو لے کر آج کل طبی طریقوں سے محفوظ کر لیتے ہیں اور
ان کو کسی اندھے کے لئے استعمال کر کے اسے بینائی بخشتے ہیں۔
(خطبات بہاول پور ص:۳۸۸)

ہم بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے پیش نظر سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے قرآن پاک، حدیث شریف اور قدیم کتب فقہ کی طرف رجوع نہیں فرمایا، ورنہ تو محط کشیدہ جملے ان کی زبان پر نہ آتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب مختصراً قرآن مجید میں، اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ حدیث شریف میں اور مزید شرح و بسط کے ساتھ فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ تفصیل کی تو ان اوراق میں گنجائش نہیں ہے، تاہم مالا یدرک کلہ، لا یترک کلہ بقدر ضرورت ہم اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کریم اور اعضاء کی پیوند کاری:

قرآن پاک میں شرک کی قباحت اور اس کے بارے میں وعید سناتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ مشرک لوگ تو دراصل شیطان کے پجاری ہیں۔ وَ اِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطَانًا مَّرِیْدًا: النساء آیت:۱۱۷۔ حالانکہ شیطان تو بنی آدم کا ازلی دشمن ہے اور وہ پہلے ہی کہہ چکا ہے:

(۱) اے اللہ! میں تیرے بندوں سے اپنا حصہ لے کر رہوں گا۔

(۲) وَ لَاُضِلَّنَّهُمْ۔ میں انہیں (نظری اور فکری لحاظ سے) گمراہ کر کے رہوں گا۔

(۳) وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ۔ میں انہیں ہوا و ہوس کے بندے بنا کر چھوڑوں گا۔

(۴) نتیجتاً وہ غیر اللہ کے نام کی قربانیاں کریں گے اور نشانی کے طور پر جانوروں کے کان کاٹ کر چھوڑیں گے۔

(۵) وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ۔ میں انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ کو بدل دیا کریں گے۔ (سورۂ نسآ: ۱۱۸، ۱۱۹)

یہ تغییر خلق اللہ کیا ہے؟ اس بارے میں قدیم اور جدید مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم تفسیر بیضاوی کا ایک جملہ یہاں نقل کرتے ہیں:

"و يندرج فيه ما قيل من فقأ عين الحامي و خصاء العبيد و الوشم و الوشر و اللواط و السحق و نحو ذلک."

ترجمہ:..... "اس میں یہ صورتیں شامل ہیں (۱) یہ جو کہا جاتا ہے کہ حامی (حامی اس سانڈ اونٹ کو کہا جاتا ہے جو ان مشرکین کی مقررہ تعداد کے مطابق بچے جنوا دیتا۔ پھر وہ اس کی ایک آنکھ پھوڑ کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے، نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اس کی اون وغیرہ اتاری جاتی۔) اونٹ کی آنکھ پھوڑ دیا کرتے تھے۔ (۲) غلاموں کو خصی کر کے خسرے بنا لینا۔ (۳) زیبائش کے لئے بدن کا گدوانا۔ (۴) عورتوں کا اپنے دانت باریک کروالینا۔ (۵) مردوں اور عورتوں کی ہم جنس بازی..... وغیرہ وغیرہ"

کم و بیش یہی تفسیر امام رازیؒ اور دیگر مفسرین حضرات نے کی ہے۔ دور حاضر

کے مفسر مولانا عبدالماجد دریا آبادی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"جاہلیت جدیدہ کی ترقیوں نے ان سے کہیں بڑھ بڑھ کر مثالیں نہ صرف ایجاد کرلی ہیں، بلکہ انہیں پھیلا کر فیشن میں داخل کردیا ہے۔ مثلاً مردوں کا چہرے کے بال بالکل صاف کرکے اور طرح طرح کی نزاکتیں اختیار کرکے زیادہ سے زیادہ حد تک عورت بن جانا۔ عورتوں کا سر کے بال کٹا کر اور مردانہ وضع ولباس اختیار کرکے زیادہ زیادہ حد تک مرد بن جانا، ایسے آپریشن کرانا جن سے جنس تبدیل ہوجائے....."

(تفسیر ماجدی ص:۲۱۶)

بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایئے، قرآن پاک کی سب سے عمدہ تفسیر وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ خود فرمادیں۔ درج ذیل حدیث شریف پڑھئے اور اندازہ لگایئے کہ کیسی کیسی صورتیں تغییر خلق اللہ میں آتی ہیں۔

مسند احمد، صحیح بخاری (ج:۲ ص:۲۷۹) اور صحیح مسلم (ج:۲ ص:۲۰۵) سمیت تمام کتب حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ نے اور اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو:

اَلْوَاشِمَات۔ بدن کو گودنے والی ہوں۔

وَ الْمُسْتَوْشِمَات۔ بدن کو گدوانے والی ہوں۔

وَ الْمُتَنَمِّصَات۔ چہرے کے بال صاف کرانے والی ہوں۔

وَ الْمُتَفَلِّجَات۔ (خوبصورتی کے لئے ریتی وغیرہ کے ذریعے) دانتوں میں فاصلہ کرانے والی ہوں۔

الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ۔ ایسی تمام عورتیں اللہ کی بنائی ہوئی شکل کو تبدیل کرنے والی ہیں۔

وَشْم: کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بازو یا ہتھیلی کی پشت پر یا اور کہیں سوئی سے بدن کو چھید کر اسے سرمہ وغیرہ سے بھر دے۔ ہمارے ہاں غیر مسلم اقوام میں اس کا رواج زیادہ ہے۔ دور جاہلیت میں عورتیں اس طرح بدن کو خوبصورتی کے لئے گدوا لیتی تھیں۔

نَمْص: سے مراد یہ ہے کہ ماتھے یا کانوں کے قریب اگے ہوئے بالوں کو اکھڑوا دیا جائے یا بھوؤں کے بال جڑے ہوئے ہوں تو درمیان کے بال اکھیڑ کر فاصلہ پیدا کرلیا جائے۔

اس حدیث شریف کے مطابق جب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں، اللہ کی بناوٹ کو تبدیل کرنے کی مد میں آتی ہیں، تو پھر خیال فرمایئے کہ آدمی کا اپنے جسم کا کوئی حصہ Donate کر دینا یا قیمتاً دے دینا کیونکر اس مد میں شامل نہ ہوگا؟

ایک شبہ:

اس جگہ قارئین کے دل میں ایک شبہ آسکتا ہے کہ ان احادیث سے تو اس تغییر خلق اللہ کی رکاوٹ معلوم ہوتی ہے جو محض زیب و زینت کے لئے ہو۔ اعضاً کی وہ پیوندکاری جو بیماری کے علاج کے طور پر کی جائے، اس کی رکاوٹ کا تو کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا جواب آئندہ سطور میں آئے گا۔

ایک اور شبہ اور اس کا جواب:

ایک شبہ یہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ آدمی سر اور چہرہ کے بال درست کرواتا ہے،

لبیں لیتا ہے، داڑھی کے بھی کچھ بال لیتا ہے، ختنہ کراتا ہے، بغلوں اور زیر ناف کے بال صاف کرتا ہے، ناخن کاٹتا ہے..... یہ تمام صورتیں بھی اللہ کی بناوٹ کو بدل دینے کی ہیں، تو پھر یہ بھی ناجائز ہونی چاہئیں۔ یہ کیونکر جائز ہوگئیں؟

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے کام خصال فطرت کے زمرہ میں شامل ہیں یعنی انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ آدمی یہ کام کرے، اسی لئے ہر دور میں تمام انبیاءؑ علیہم السلام ان باتوں کی تعلیم دیتے آئے ہیں۔ گویا یہ خلق اللہ کا حصہ ہیں۔ اس کے منافی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر بچہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کے منہ میں دانت نہیں ہوتے، یہ اس کی شیر خوارگی کی عمر کے عین مطابق ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ منہ دانتوں سے بھر جاتا ہے۔ یہ اس عمر کا فطری تقاضا تھا، جس کا انتظام خالق نے فرمادیا۔

قرآن کریم کی رو سے انسان کا مرتبہ اور اس کا تقاضا:

قرآن کریم کی رو سے انسان کا مرتبہ و مقام، کائنات میں سب سے اونچا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (الاسراء: ۷۰) ہم نے اولاد آدم کو برتری بخشی۔

یہ انسان ہی ہے جس کی عظمت اور برتری کا بیان اللہ تعالیٰ نے ان دو جملوں میں فرمایا:

۱:.....نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ: سورۃ ص آیت: ۷۲۔ میں نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

۲:.....خَلَقْتُ بِيَدَيَّ: سورۃ ص آیت: ۷۵۔ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔

حضرت انسان کے اسی بلند مرتبہ و مقام کی وجہ سے اسے مخدوم ٹھہرایا اور باقی تمام کائنات کو اس کا خادم بنایا، چنانچہ فرمایا گیا:

"خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: البقرۃ: آیت: ۲۹

"اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ: الحج: آیت: ۶۵

"سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ: ابراھیم: آیت: ۳۳

انسان کے اس اشرف المخلوقات ہونے کا نتیجہ ہے کہ اس کی زندگی میں بھی اس کا احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے، اور مرجانے کے بعد بھی۔ اسی لئے حدیث شریف میں حکم دیا گیا: اکرموا اخاکم حیًّا و میتًا۔ اور اسی لئے انسان کے کسی جزٔ کو دوسرے جسم میں منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ اس کے بالوں، کھال اور ہڈیوں تک کو استعمال میں لانے کی شریعت نے رکاوٹ کردی۔ چند حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

(۱) فقہ حنفی کی مشہور کتاب ھدایہ میں ہے: "و حرمة الانتفاع باجزاء الآدمی لکرامته۔" یعنی انسان کے محترم اور معزز ہونے کی وجہ سے اس کے اجزاٗ سے نفع اٹھانا حرام ہے۔

(۲) ھدایہ کی شرح عنایہ میں ہے: " لئلا یتجاسر الناس علی من کرمه الله بابذال اجزا ئه۔" یعنی اللہ نے جس کو عظمت بخشی ہے، لوگ اس کے اعضاٗ کو بے وقار ٹھہرا کر اس کی ناقدری کے لئے دلیر نہ ہوجائیں۔

(۳) ملک العلماٗ امام کاسانیؒ جو فقہاٗ احناف میں بہت اونچا پایہ رکھتے ہیں، فرماتے ہیں: " لا یجوز بیعها و یحرم الانتفاع بها احتراما للآدمی کما اذا طحن سن الادمی

مع الحنطة او عظم لا یباح تناول الخبز من دقیقها۔"

(بدائع ج:۱ ص:۶۳)

ترجمہ:....."انسانی اجزاء کا بیچنا جائز نہیں اور ان سے نفع اٹھانا حرام ہے کیونکہ انسان واجب الاحترام ہے۔ مثلاً اگر آدمی کا کوئی دانت یا اس کی کوئی ہڈی گندم کے ساتھ پس جائے تو اس کے آٹے سے تیار شدہ روٹی کا کھانا درست نہیں ہے۔"

(۴) علامہ ابن نجیم مصری، جن کو ابو حنیفۂ ثانی کہا جاتا ہے، فرماتے ہیں:

"لایجوز الانتفاع به و لا دبغه احتراما له. و علیه اجماع المسلمین کما نقله ابن حزم:"

(البحر الرائق ج:۱ ص:۱۰۱)

"یعنی آدمی کی کھال سے نہ تو نفع اٹھانا درست ہے اور نہ اس کو رنگنا وغیرہ جائز ہے کیونکہ اس کا احترام پیش نظر ہے۔ اسی پر مسلمانوں کا اتفاق ہو چکا ہے، جیسا کہ امام ابن حزم نے نقل کیا ہے۔"

(۵) امام نوویؒ جو ساتویں صدی ہجری میں علماء شافعیہ میں ایک نہایت ہی بلند پایہ محدث اور فقیہ گزرے ہیں، اوپر نقل شدہ حدیث "لعن الله الواصلة و المستوصلة" کی شرح میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ان وصلت شعرها بشعر ادمی فهو حرام بلا

خلاف سواء كان شعر رجل او امرأة و سواء شعر المحرم و الزوج و غيرهما بلا خلاف لعموم الاحاديث و لانه يحرم الانتفاع بشعر الادمى و سائر اجزائه لكرامة بل يدفن شعره و ظفره و سائر اجزائه."

(شرح مسلم للنووی ج:۱ ص:۲۰۴)

ترجمہ:..... "اگر عورت اپنے بالوں میں کسی آدمی کے بال جوڑ لیتی ہے تو یہ حرام ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ خواہ وہ کسی مرد کے بال ہوں یا عورت کے، خواہ کسی محرم یا خاوند کے ہوں یا کسی اور کے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہ احادیث عام ہیں..... اور اس لئے کہ آدمی کے بالوں اور دوسرے اعضاء سے نفع اٹھانا حرام ہے۔ بوجہ اس کے مستحق عزت ہونے کے۔ بلکہ اس کے بال، ناخن اور دوسرے اجزاء دفن کر دیئے جائیں۔"

یوں تو انہی حوالہ جات سے مسئلہ بہت حد تک واضح ہو چکا ہے، مگر ہم نے فقہی عبارتیں صرف اس لئے نقل کی ہیں کہ انسان کو جو اللہ نے اشرف المخلوقات قرار دیا ہے، اس کا یہی مرتبہ اور مقام، تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اجزاء اور اعضاء سے کسی طرح استعمال کر کے نفع حاصل کرنا اور ان کی خرید و فروخت ممنوع ہو۔ چنانچہ بالاتفاق علماء امت کے نزدیک ایسا کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

حدیث شریف کی رو سے اعضاء کی پیوند کاری:

کسی مریض کے جسم میں کسی صحیح سالم عضو کا فٹ کرنا، ظاہر ہے کہ آپریشن کے ذریعے ہوگا، یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کی فٹنگ کا مرحلہ تو بعد میں آئے گا، اس سے پہلے تو کسی جسم سے تندرست عضو کے لینے کا مرحلہ ہوگا جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے۔ ایک نو مردہ بدن سے آنکھیں یا دل، یا پھیپھڑا یا جگر وغیرہ نکال لیا جائے تو آپریشن میں ہڈیوں کی توڑ پھوڑ، چمڑے کی چیر پھاڑ، گوشت کی قطع برید ہونا لازمی امر ہے۔ آیئے ہم اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ تو سنئے:

مسند احمد، سنن ابی داؤد (ج:۲ ص:۱۰۳)، مؤطا امام مالک اور سنن ابن ماجہ میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ: ''کسر عظیم المیت ککسرہ حیاً۔''

ترجمہ: '' مردے کی ہڈی کا توڑنا اس طرح ہے جیسا کہ زندہ آدمی کی ہڈی کا توڑنا ہے۔''

ابو داؤد کے شارح، محدث سہارنپوریؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:

''ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کسی جنازے کے ہمراہ قبرستان تشریف لے گئے۔ وہاں گورکن ابھی اپنے کام سے فارغ نہیں ہوا تھا، حضور اقدس ﷺ قبر کے ایک کنارے بیٹھ گئے، صحابہ بھی بیٹھ گئے۔ اتنے میں گورکن نے ایک ہڈی نکالی جو پنڈلی یا بازو کی ہڈی معلوم ہوتی تھی، وہ اس کو توڑنے لگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اسے نہ توڑ، مردہ کی ہڈی کا توڑنا ایسے

ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی کا۔ اس کو قبر میں کسی طرف دے دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس فرمان گرامی کا سبب یہ واقعہ بنا۔"

(بذل المجھود ج:۵ ص:۲۰۹)

مؤطا شریف اور ابن ماجہ میں ایک لفظ کا اضافہ ہے: "فی الاثم۔" یعنی گنہگار ہونے کے لحاظ سے مردہ کی ہڈی توڑنا، زندہ آدمی کی ہڈی توڑنے کے برابر ہے۔

یہ روایت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ مؤطا امام مالک کی شرح میں ابن ابی شیبہ کے حوالے سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی گئی ہے:

"اذی المؤمن فی موته کاذاه فی حیاته."

(اوجز المسالک)

ترجمہ:..... "مسلمان کو مرجانے کے بعد تکلیف دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندگی میں اسے ایذا پہنچانا۔"

ایسی ہی احادیث کی وجہ سے بلوغ المرام کے شارح نواب زادہ نورالحسن خاں لکھتے ہیں:

"و فیه دلالة علی وجوب احترام المیت کما یحترم الحیّ" (فتح العلام ج:۱ ص:۲۵۲)

ترجمہ:..... "اس سے معلوم ہوا کہ مردے کا احترام بھی اسی طرح لازم ہے جس طرح کہ زندہ کا احترام ہوتا ہے۔"

خود میت کو براہ راست ایذا پہنچانا تو دور کی بات ہے، ہمیں تو حدیث شریف

یہ حکم دیتی ہے کہ آدمی قبر سے ٹیک لگا کر نہ بیٹھے۔ چنانچہ عمرو بن حزم نامی انصاری صحابیؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے قبر سے ٹیک لگائے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

"لا تؤذ صاحب القبر" (اس قبر والے کو تکلیف نہ دے)۔

اور مسلم شریف میں حضرت ابوھریرہؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لان یجلس احدکم علی جمرۃ فتحرق ثیابہ فتخلص الی جلدہ خیر لہ من الجلوس علی قبر."

(مسلم شریف ج:۱ ص:۳۱۲)

ترجمہ:....."ایک آدمی انگارے پر بیٹھ جائے اور وہ انگارہ اس کے کپڑوں کو جلا کر اس کی کھال تک پہنچ جائے، یہ اس کے لئے قبر پر بیٹھنے سے بہتر ہے۔"

قارئین کرام! ایک طرف شریعت مقدسہ کا یہ مزاج دیکھئے کہ وہ اپنے ماننے والوں سے مسلمان میت کے بارے میں کیا چاہتی ہے اور کیا حکم دیتی ہے۔ دوسری طرف روشن خیال اہل علم کی یہ فراخ دلی ملاحظہ ہو کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور توڑ پھوڑ کی اجازت دے رہے ہیں!

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا!

دوسری حدیث:

صحاح ستہ اور دیگر تمام معتبر کتب حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لعن الله الواصلة و المستوصلة."

ترجمہ:..... "اللہ نے بال جوڑنے والی اور جڑوانے والی عورت پر لعنت کی ہے۔"

اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی کتابوں میں درج ہے کہ ایک انصاری عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی اور عرض گزار ہوئی کہ حضور! میری ایک بیٹی کی تھوڑا عرصہ پہلے شادی ہوئی ہے اور وہ خسرہ کی بیمار ہوگئی جس سے اس کے سر کے بال اُڑ گئے ہیں، تو کیا میں اس کے بالوں کے ساتھ اور بال جوڑ لوں؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ بال جوڑنے اور جڑوانے والی دونوں لعنتی ہیں۔

کچھ غور فرمایا آپ نے؟ یہاں تو ایذا رسانی کا کوئی سوال نہیں، بلکہ بعض اوقات ایک آدمی بالوں کو بوجھ سمجھ کر اپنے سر کو ان سے آزاد کرانا چاہتا ہے، وہ تو اُلٹا بالوں کے اتروا دینے سے راحت محسوس کرتا ہے، پھر بھی اس کے بال، دوسرا آدمی، حتیٰ کہ کوئی عورت بطور علاج بھی کام میں نہیں لاسکتی۔

تیسری حدیث:

رسول اللہ ﷺ جب کسی کو سپہ سالار بنا کر روانہ فرماتے تو آپؐ اسے چند ہدایات دیتے تھے، جن میں سے ایک یہ ہوتی تھی کہ لا تمثلوا یعنی فتح یابی کے بعد دشمن کے ناک، کان، ہونٹ وغیرہ نہ کاٹے۔ (مسلم شریف)

جنگ احد میں کفار مکہ نے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو انتہائی قلق پہنچا، آپؐ نے آئندہ دشمن سے اس کا بدلہ لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا، مگر قرآن پاک میں سختی سے اس کی رکاوٹ کردی گئی۔ تو جو شریعت دشمن کو بدزیب بنانا گوارا

نہیں کرتی، جب کہ کافر کسی تعظیم و تکریم کا مستحق نہیں ہے تو کیا وہ کلمہ گو مسلمان کے بارے میں اس کی اجازت دے گی؟

کتب فقہ اور اعضاً کی پیوندکاری

ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم فقہی لحاظ سے حنفی مسلک کے پیروکار ہیں اور ہمارے پاس فقہ حنفی کے علاوہ کسی اور فقہ کی (چند مختصرات کے علاوہ) کتب نہیں ہیں، اس لئے ہم یہاں پر فقہ حنفی کی معتبر کتب کے چند حوالہ جات پر اکتفا کریں گے۔ یہ حوالہ جات ان فقہی عبارتوں کے علاوہ ہیں، جو پہلے نقل ہو چکی ہیں۔

حالت اضطرار میں انسانی گوشت کھانا:

"مضطر لم یجد میتة و خاف الهلاک، فقال له رجل اقطع یدی و کلها او قال اقطع منی قطعة و کلها لا یسعه ان یفعل ذلک. و لا یصح امرد به کما لا یسع للمضطر ان یقطع قطعة من نفسه فیأکل."

(فتاویٰ قاضی خاں مطبوعہ نولکشور ص:۷۸۰۔ فتاویٰ عالمگیریہ مطبوعہ کوئٹہ ج:۵ ص:۳۳۸۔ فتاویٰ بزازیہ علی ھامش الھندیہ ج:۶ ص:۳۶۶۔ خلاصۃ الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۶۶)

ترجمہ:..... "ایک شخص حالت اضطرار میں ہے اور اسے کوئی مردار (یا سور کا گوشت) نہیں مل رہا۔ اور اسے مرجانے کا اندیشہ ہے، ایک شخص نے اس سے کہا کہ تو میرا ہاتھ کاٹ کر اسے

کھالے، یا یوں کہا کہ میرے بدن کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر اسے کھالے تو اس کے لئے ایسا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اس کا اس بات کی اجازت دینا بھی صحیح نہیں ہے، جس طرح کہ مجبور آدمی کے لئے یہ ٹھیک نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر کھالے۔"

انسانی اعضاً سے فائدہ اٹھانا:

"الانتفاع باجزاء الآدمی لم یجز."

(فتاویٰ عالمگیریہ ج:۵ ص:۳۵۴)

ترجمہ:....."انسانی اعضاً سے کسی طرح نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔"

"رجل برجله جراحة قالوا یکره له ان یعالجه بعظم الانسان..... لانه محرم الانتفاع."

(خلاصۃ الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۶۱۔ فتاویٰ عالمگیریہ ج:۵ ص:۳۵۴)

ترجمہ:....."ایک شخص کی ٹانگ میں زخم ہو تو اس کے لئے یہ ٹھیک نہیں ہے کہ وہ انسان کی ہڈی سے اس کا علاج کرے کیونکہ اس سے نفع اٹھانا حرام ہے۔"

"ولو سقط سنه یکره ان یاخذ من میّت سنه، فیشدها مکان الاول بالاجماع." (بدائع ج:۵ ص:۱۳۳)

ترجمہ:....."اگر آدمی کا دانت گر جائے تو یہ ٹھیک نہیں

ہے کہ وہ کسی مردہ کا دانت لے کر اسے پہلے کی جگہ لگادے۔ اس پر فقہاءؒ متفق ہیں۔"

اس مسئلہ میں تو فقہاءؒ اسلام یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے کسی اور آدمی کا دانت لگوایا تو اس دانت کے ہوتے ہوئے نماز تک صحیح نہیں ہوتی۔ دیکھئے خلاصۃ الفتاویٰ، البحر الرائق وغیرہ۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یا اور کوئی صاحب جو اعضاءؒ کی زیر بحث پیوندکاری کو درست قرار دیتے ہیں، انہیں مغالطہ یہ ہے کہ انہوں نے انسان کو اپنے بدن کا یا بدن کے اعضاءؒ کا مالک تصور کرلیا ہے، اس لئے ان کا خیال ہے کہ ہر شخص کو اپنے بدن میں ہر قسم کے تصرف کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ حالانکہ شرعی مسئلہ یوں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک آدمی کے لئے اجازت ہوتی کہ وہ پریشان کن حالات میں تنگ آکر اپنے آپ کو قید حیات سے آزاد کرالیتا، جب کہ اس کے برخلاف قتل کرنا، شرک کے بعد دوسرے نمبر پر گناہ کبیرہ ہے اور پھر دوسرے کو قتل کرنے سے، خودکشی اور زیادہ بڑا گناہ..... یوں کہئے کہ عملی گناہوں میں سب سے بڑا اور بدترین..... گناہ ہے۔

اعظم وزراً من قتل غیرہ۔ (درمختار)

آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک ایسے آدمی کا جنازہ لایا گیا جس نے تیر کے پھل سے اپنے آپ کو ماردیا تھا، تو آپؐ نے فرمایا: "**اما انا فلا اصلی علیہ۔**" میں تو اس کی نماز جنازہ ادا نہیں کرتا۔ (مسلم شریف ونسائی وغیرہ) اس حدیث کی بناءؒ پر بعض ائمہؒ دین نے خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ کی رکاوٹ فرمادی ہے، جب کہ دوسرے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ خواص ایسے آدمی کا جنازہ نہ پڑھیں، عوام ادا کرلیں۔

مختصر یہ کہ اس مسئلہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انسان اپنے جسم کا

مالک نہیں ہے، اسی لئے فقہاءؒ نے یہ فرمایا ہے کہ اتنا کھانا، کھانا جس سے آدمی کی زندگی بحال رہے، فرض ہے۔ اگر نہیں کھاتا اور مرجاتا ہے، تو وہ بھی خودکشی کا مرتکب شمار ہوگا۔ اس کے باوجود جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کھانے کے لئے جب آدمی کو کچھ میسر نہ آئے اور حالت اضطرار میں اسے کہیں سے مردار یا خنزیر کا گوشت بھی نہ ملے، پھر بھی وہ اپنا یا کسی اور آدمی کا بدن کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر جان بچانے کے لئے اسے نہیں کھا سکتا، (جیسا کہ ابھی البدائع کا حوالہ گزرا ہے) تو پھر علاج کے لئے ایک آدمی کا کوئی عضو لے کر کسی دوسرے میں فٹ کرنے کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟

اور معاف کیجئے، اگر سہولتیں پیدا کرنے والے حضرات یوں Undue اجازتیں دیتے چلے گئے تو نہیں کہا جاسکتا، بات کہاں تک جا پہنچے گی؟ وہ وقت دور نہیں، جب کہ اچھے سے اچھا انسانی تخم، مشینی آلات کے ذریعے رحموں میں پہنچایا جائے گا اور اس وقت کے فضلاءؒ کہیں گے:

> ''ہمارے نزدیک ایسی صورت میں جب کہ ایک مال دار جوڑا اولاد سے محروم ہے اور وہ اپنے دھن دولت کے بارے میں فکرمند ہے کہ اس کا کیا ہوگا یا اولاد کی فطری خواہش ہو اور اس مصنوعی طریقہ سے اولاد حاصل کی جاسکتی ہو، تو ایسا کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔''

ہماری غیر مسلم ہمسایہ قوم (ہندو) نیوگ جیسے قبیح اور حیا باختہ فعل کی روادار ہے، تو کیا بعید ہے کہ ہمارے سہولت پسند اور تقاضائے وقت کا بہانہ ڈھونڈنے والے ''مجتہدین'' بھی کئی ناجائز کاموں کو جواز کا درجہ دے دیں۔

سیرت طیّبہ اور انشورنس

جناب ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خطبہ ''تاریخ حدیث شریف'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں موصوف نے میثاق مدینہ کا ذکر کرتے ہوئے انشورنس (یعنی بیمۂ زندگی) کے بارے میں فرمایا:

''مدینہ منورہ میں دو مسئلے بہت اہم تھے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص غلطی سے کسی شخص کے قتل کا مرتکب ہوتا تو اسے خون بہا دینا پڑتا تھا۔ خون بہا کی رقم رواج و قانون کے مطابق اتنی زیادہ تھی کہ عملاً ساری آبادی میں سے ایک آدھ شخص ہی ادا کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے لئے وہ ناممکن سی بات تھی، یعنی ایک سو اونٹ۔ .....اس کے لئے اجتماعی انشورنس کا انتظام کیا گیا یعنی ایک قاتل ہی اس کا ذمہ دار نہ ہوگا بلکہ پوری انشورنس کمپنی اس کی ذمہ داری قبول کرے گی اور اس کی طرف سے خون بہا ادا کرے گی..... رسول اکرم ﷺ نے یہ انتظام کیا کہ مدینہ منورہ میں ہر ہر قبیلے میں ایک انشورنس یونٹ قائم فرمایا اور یہ کہا کہ تمہارے قبیلے کے کسی آدمی کو قتل یا گرفتاری کے سلسلے میں رقم ادا کرنی ہو اور وہ شخص ادا نہ کر سکے تو یہ انشورنس یونٹ ادا کرے گی اور اگر کسی یونٹ کے پاس اتنی گنجائش نہ ہو تو حکم تھا، اس کے قریبی محلے کی جو انشورنس یونٹ ہے، وہ اس کے ساتھ تعاون کر کے رقم ادا کرے۔ اگر اس کے پاس بھی نہ ہو تو دوسری یونٹ سے انتظام

کیا جائے۔ جب ساری آبادی کی یونٹیں بھی بار نہ اٹھا سکیں تو ایسی صورت میں حکومت بھی مدد کرے گی۔"

خطبہ کے اختتام پر جب سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو سوال نمبر ۱۱ کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا، اس کے چند جملے درج ذیل ہیں:

"عہد نبوی میں جو انشورنس کا نظام تھا وہ MUTUALIST INSURANCE سے کچھ قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ وہ حقیقت میں ایک دوسرے کے تعاون اور امداد باہمی کے اصول پر مبنی تھا۔ یعنی ایک قبیلے کے جملہ افراد اپنے قبیلہ کی انجمن کے خزانے کو سالانہ تھوڑی تھوڑی رقم دیتے ہیں اور جب کبھی کوئی حادثہ پیش آتا ہے، تو کمپنی کا یہ سرمایہ جو سارے افرادِ قبیلہ کی طرف سے آیا تھا، اس ایک شخص کی ضرورت کے کام آتا ہے جسے ہرجانہ ادا کرنا ہے۔" (خطبات ص:۷۹۔۸۰)

ڈاکٹر صاحب کے ارشادات کا جائزہ لینے سے پہلے ہم قارئین کو "انشورنس" کے پس منظر کی طرف توجہ دلائیں گے، اور اس سلسلہ میں ہم قوم بنی اسرائیل (یہود) کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا چاہیں گے۔

بنی اسرائیل کا تعارف:

قارئین کی اکثریت جانتی ہے کہ "اسرائیل" سیدنا یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ آپؑ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ آپؑ کے بارہ بیٹے تھے، جن میں سے ایک سیدنا یوسف علیہ السلام

تھے۔ جب حضرت یوسفؑ کو مصر میں اقتدار حاصل ہوا، تو آپؑ نے اپنے والدین اور گیارہ بھائیوں کو وہیں بلوالیا۔ آپؑ کی حیات میں ان لوگوں کی خاصی آؤ بھگت رہی، مگر ان کا کوئی وقار نہ رہا۔ ان کے بارہ قبیلے ہو چکے تھے، انہی کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ مصر میں ان کی بے وقاری بڑھتی چلی گئی۔ یہ لوگ غلامی کی زندگی بسر کرنے لگے تا آنکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور آپؑ اپنی قوم کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوئے۔ بحیرۂ قلزم کو عبور کر کے یہ واپس اپنے وطن آ گئے۔

بنی اسرائیل کی اخلاقی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ بدعہدی، کینہ پروری اور لالچ جیسی بُری صفات ان کی انفرادی اور قومی زندگی میں رچ بس گئی تھیں۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں وہ رہ رہ کے ذلت آمیز کردار کے نمونے پیش کرتے رہتے تھے۔ دو شخص انتہائی بدبخت شمار ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی نبی کا قاتل ہو اور دوسرا وہ جو کسی نبی کے ہاتھ سے قتل ہو۔ بنی اسرائیل ایسے بدبخت تھے کہ حضرات انبیاءؑ علیہم السلام کو شہید کرنے سے نہیں چوکتے تھے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔'' (البقرہ آیت:۶۱)

بنی اسرائیل کی شقاوت اور بدبختی کی طویل تاریخ میں دو اہم واقعات، تورات کی پیش گوئی کے مطابق، پیش آئے۔ پہلا یہ کہ عراق کے بادشاہ بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کیا اور ہزاروں کو قتل کرنے کے بعد ہزاروں کو جنگی قیدی بنا کر عراق لے آیا۔ بعد ازاں ایران کے بادشاہ نے عراق پر چڑھائی کی اور فتح یاب ہونے کے بعد اس نے بنی اسرائیل کو وطن واپس جانے کی اجازت دی۔ دوسری مرتبہ رومی فلسطین پر حملہ آور ہوئے اور اسے تخت و تاراج کیا۔ اب ان میں سے ایک بڑی آبادی نے عرب کا رخ کیا اور تورات ہی کی پیشگوئی کے مطابق کھجوروں والے علاقے میں (یثرب اور خیبر) میں آباد

ہو کر نبی آخر الزمان ﷺ کے ظہور کا انتظار کرنے لگے۔

یہودیوں کی ایک بُری عادت :

یہودی جن بُری عادات میں مبتلا تھے، ان میں سے ایک حرام خوری کی صفت ہے۔ قرآن پاک میں متعدد جگہ ان کی اس وصف شنیع کا ذکر آیا ہے : ''اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔'' (سورۂ مائدہ:۴۲) یعنی یہ لوگ بڑھ چڑھ کر حرام کھانے والے ہیں۔

''یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَکْلِهِمُ السُّحْتَ''

(مائدہ:۶۲)

یعنی یہ لوگ گناہ کرنے، زیادتی کرنے اور حرام کھانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہودی عالموں اور درویشوں کی اپنے فرض سے غفلت :

قومی بگاڑ اس وقت تک قابل اصلاح ہوتا ہے، جب تک کہ مذہبی پیشوا اپنا فرض ادا کرتے رہیں اور اگر یہ طبقہ اپنے فرض سے غافل ہو جائے تو ظاہر ہے کہ مرض بڑھتا چلا جائے گا۔ بدقسمتی سے بنی اسرائیل کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ نہ ان کے مولویوں کو اصلاح کی کوئی فکر، نہ پیروں فقیروں کو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ان کی فرض ناشناسی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے :

'' لَوْ لَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَکْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ.''

(مائدہ:۶۳)

ترجمہ:.....''ان کو درویش لوگ اور عالم کیوں نہیں

روکتے بُری بات کہنے اور حرام کھانے سے۔ وہ لوگ بہت ہی بُرا کرتے ہیں۔"

اوروں کو روکنا تو کجا؟ الٹا یہی مولوی اور درویش دولت کے پجاری بن گئے۔ عوام کی مرضی کے مطابق فتوے دے کر اور شرعی احکام میں ہیرا پھیری کر کے روپیہ کمانا ان کا شیوہ بن گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا گیا:

"اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ." (توبہ:۳۴)

ترجمہ:..... "یقیناً بہت سے عالم اور پیر لوگ ناحق لوگوں کے مال بٹورتے ہیں۔"

چلو تم ادھر ہوا ہو جدھر کی:

قومی بدبختی اس وقت نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے، جب کہ قوم کا مذہبی طبقہ بدکاری میں قوم کا ہمنوا ہو جائے۔ ایک انگریز عیسائی نے ایک مسلمان سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ خنزیر مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک حرام ہے۔ مگر عیسائی بے تکلف اس کو کھاتے ہیں، جب کہ مسلمان بالعموم اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ مسلمان نے اس کا یہ جواب دیا: اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی طبقہ اس کے قریب نہیں گیا، اس لئے ان کے عوام میں اس کی حرمت کا احساس باقی ہے، جب کہ پادری لوگ بے تکلف اس کو کھاتے ہیں، اس لئے ان کے عوام میں حرمت کا احساس نہیں رہا۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بنی اسرائیل

گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے انہیں روکا، وہ باز نہ آئے تو وہ عالم بھی ان لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے لگ گئے۔ (مشکوٰۃ شریف ص:۴۳۸)

گندم از گندم بروید جو زجو:

مکافات عمل قدرت کا قانون ہے، نیکی کا انجام نیک اور برائی کا انجام برا ہوتا ہے۔ جب بنی اسرائیل قوم من حیث القوم، عصیاں کاری میں مبتلا ہوگئی تو قہر الٰہی جوش میں آیا۔ یہ قوم لعنت کی مستحق ٹھہری۔ رحمت الٰہی سے محروم ہوکر بربادی کا شکار ہوئی، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

"لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ." (مائدہ:۷۸)

ترجمہ:..... "بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی، ان پر (حضرت) داؤد اور (حضرت) عیسیٰ کی زبانی پھٹکار پڑی۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ نافرمان ہوگئے اور زیادتی پر زیادتی کرتے چلے گئے۔"

زبور اور انجیل میں صدہا تحریفات کے باوجود، ان لعنتوں کا ذکر اب بھی موجود ہے۔

امت مسلمہ کے لئے تنبیہ:

آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کو تنبیہ فرمادی تھی کہ آگے چل کر یہ نہ بنی اسرائیل کی راہ پر چل نکلے، تاکہ کہیں اس کا انجام بنی اسرائیل کا سا نہ ہو۔ اس کے لئے

آپؐ نے بلیغ انداز اختیار فرمایا۔ ارشاد ہوا:

"لتتبعن سنن من کان قبلکم شبرا بشبر، ذراعا بذراع، حتیٰ لو دخل احدھم حجر ضب لدخلتموہ."

ترجمہ:..... "(اندیشہ ہے) کہ تم ضرور پہلے لوگوں کے طریقوں پر چل نکلو گے۔ بالشت کے برابر بالشت، ہاتھ کے برابر ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی آدمی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوا تھا تو تم بھی داخل ہو کر رہو گے۔"

اس تنبیہ اور تحذیر کے باوجود، آنحضرت ﷺ کو جس بات کا اندیشہ تھا، وہ پوری ہو کر رہی۔ بود و باش سے لے کر نظریات و افکار تک، تمام امور میں مسلمان، یہود و نصاریٰ کے پیروکار اور نقال بن گئے۔

اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ :

بنی اسرائیل (یہود) کی بداعتقادی، بدعملی اور بداخلاقی کی تاریخ دیکھنا ہو تو قرآن پاک کی ابتدائی سورتوں کو پڑھ کر دیکھئے۔ سورۃ النسأ کی آیات نمبر ۱۵۳ تا ۱۶۱ میں اس بدقماش قوم کی کم و بیش ایک درجن برائیاں گنوائی گئی ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر۔ حتیٰ کہ یہ فرمادیا گیا کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن نمبر ایک پر یہودی اور نمبر دو پر مشرکین ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: "لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا۔" (مائدہ:۸۲) گزشتہ چودہ سو سال میں پھیلی ہوئی یہودیوں اور ہندوؤں کی تاریخ اس قرآنی دعویٰ کا بین ثبوت ہے۔ اور یہودی خبیث آج ہی نہیں، عہد نبوت میں بھی کہتے تھے: "لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ۔" (آل عمران:

۷۵) یعنی ہم مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی کر گزریں، ہم کوئی قصوروار نہ ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کے خلاف جب کبھی کوئی سازش ہوئی، اس کے پس پردہ یہودی دماغ اور یہودی ہاتھ کام کر رہا تھا۔ یہودی دماغ شیطان کا کارخانہ ہے جو مسلمانوں کے خلاف نت نئی سازشیں سوچتا اور انہیں عمل میں لاتا رہتا ہے۔

یہودی اور سود خوری:

یہودیوں کو تورات میں سود کھانے سے رکاوٹ کردی گئی تھی۔ چنانچہ سینکڑوں تحریفات کے باوجود آج بھی تورات میں امتناعی احکامات موجود ہیں۔ یہودی بنیا ہر دور میں سود خوری پر کمربستہ رہا اور زیادہ سے زیادہ Intrest کمانے کے لئے وہ نئی سے نئی اسکیمیں نکالتا رہا۔ اس کے باوجود اس کا تنور شکم بھرنے کا نام نہیں لیتا اور وہ مسلسل ھل من مزید کی صدا لگا رہا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں، وہ ہر ممکن طریق سے لوگوں کا مال بٹورنے کی فکر میں رہا۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

"وَ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَ اَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ."

(سورۂ نسآ:۱۶۱)

ان لوگوں کی خباثتوں کا کہاں تک ذکر کیا جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے پیسے کمانے کے لئے قحبہ خانوں کا آغاز کیا تھا، حتیٰ کہ خود یثرب (مدینہ شریف) میں یہ کاروبار شروع کر رکھا تھا۔

اسلام میں دیت کا حکم:

شرک کے بعد اسلام میں دوسرے نمبر کا گناہ، کسی کو ناحق قتل کرنا ہے، مگر وہ جو قصداً اور عمداً ہو۔ قرآن پاک میں اس پر سخت وعید آئی ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

"فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهُ وَ اَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا." (سورۃ النسآء:۹۳)

اور خدانخواستہ جو قتل خطأً ہو جائے تو اس صورت میں وقوعہ کے دو پہلو سامنے آتے ہیں، ایک قاتل کے لحاظ سے، دوسرا مقتول کے لحاظ سے۔ قاتل کے بارے میں یہ حقیقت غور طلب ہے کہ اس کا قصد اور ارادہ اس آدمی کو مارنے کا ہرگز نہیں تھا۔ مقتول کے بارے میں یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ بلا وجہ ایک بے قصور آدمی کی جان لے لی گئی، اور ہوسکتا ہے کہ وہ حال یا مستقبل میں ایک گھرانے کا سربراہ ہو، اس کی وفات سے ایک کنبہ بے سہارا ہوگیا۔ ایک قریبی عزیز کی جدائی کا صدمہ الگ اور یہ دکھ اور پریشانی الگ۔ تو شریعت مقدسہ نے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھا۔ قاتل پر قصاص تو نہیں ہے اور وہ گناہ گار بھی نہیں ہے، یوں وہ آخرت کے وبال سے بچ گیا۔ مگر مقتول کے گھر والوں کی اشک شوئی اور ان کے نقصان کی تلافی ضروری تھی، اس لئے شریعت نے قاتل پر ایک تو کفارہ لازم کیا کہ اگر اس کے ملک میں مسلمان غلام موجود ہو، تو اسے آزاد کردے، ورنہ تو دو مہینے لگاتار روزے رکھے۔ دوسری اس پر دیت لازم کردی کہ مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا پڑے گا۔

دیت کی مقدار خواہ کچھ بھی ہو، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک انسان کی جان کا بدل نہیں ہوسکتی، مگر کوئی حد تو آخر مقرر کرنی تھی، چنانچہ وہ مقدار سو اونٹ ہے۔ اب یہ مقدار بظاہر اتنی زیادہ ہے کہ غریب یا متوسط طبقے کے لئے اس کی ادائیگی تقریباً ناممکن ہے تو اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ایک مجرم کی بجائے اس کا خویش قبیلہ اجتماعی شکل میں اس بوجھ کو برداشت کرے اور وہ بھی یکمشت ادائیگی کی صورت میں نہیں، بلکہ تین سال تک بالاقساط واجب الادا قرار دی گئی۔

دیت کا یہ رواج دور جاہلیت سے چلا آرہا تھا اور آنحضرت ﷺ نے بھی اسے جاری رکھا، اب اس لحاظ سے نہیں کہ یہ خطۂ عرب کا قدیم رواج ہے، بلکہ آنحضرت ﷺ کا حکم ہونے کی حیثیت سے یہ شریعت کا قانون ہے۔ کتب حدیث میں متعدد روایات موجود ہیں۔

قرابت داری کے لحاظ سے انسانوں کی تقسیم:

عرب میں برادری کی تقسیم کچھ اس طرح سے چلتی تھی:

۱:.....شَعْب۔ یعنی وہ لمبی چوڑی برادری جو آگے شاخ در شاخ تقسیم ہوتی چلی جائے۔

۲:.....قبیلہ۔ یہ شعب (قوم) کی شاخ ہوتی ہے جو آگے کئی حصوں میں بٹ جاتی ہے۔

۳:.....عمارہ۔ قبیلہ کی ہر شاخ کو کہا جاتا ہے۔

۴:.....بَطن۔ عمارہ کی ہر شاخ کو کہا جاتا ہے۔

۵:.....فَخذ۔ بطن کی ہر شاخ کو کہتے ہیں۔

۶:.....فَصِیلہ۔ ایک خاندان کو کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر مُضَر ایک شَعْب ہے۔ کِنَانہ قبیلہ ہے، قریش عمارہ ہے، قُصَیّ ایک بَطن ہے۔ ھاشم فخذ ہے اور بنو عبدالمطلب فصِیلہ ہے۔

قرآن پاک میں شعب، قبیلہ اور فصیلہ کے الفاظ آئے ہیں۔

اب دیت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ پہلے تو خاندان پر تقسیم کی جائے، اگر پوری نہ ہو تو پھر آگے الاقرب فالاقرب کے اصول کے تحت بڑھتے چلے جائیں۔ تفصیل

کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

میثاق مدینہ اور دیت :

قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ، جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو حالات غیر یقینی تھے۔ حضور اقدس ﷺ کو یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا پہلے سے علم تھا۔ یہاں آنے کے بعد ان سے پالا پڑنا ناگزیر تھا، دوسرا اوس اور خزرج میں سے ایک خاصا بڑا گروہ منافقین کا پیدا ہوگیا۔ ادھر قریش مکہ کی سازشیں تیز تر ہوگئیں۔ ان حالات میں یثرب (جس کا نام اب مدینہ یا طیبہ ہوگیا تھا) میں قائم ہونے والی عملداری کو اندرونی خطرات سے حتیٰ الامکان محفوظ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایک تو آپؐ نے مواخات کا سلسلہ قائم فرمایا تاکہ اندرونی حالات پرسکون ہوں۔ دوسرا آپؐ نے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ کرایا، جو باقاعدہ لکھا گیا اور فریقین کو اس کا پابند کیا گیا۔ اس معاہدہ کی تفصیل سیرت ابن ھشام جلد اول میں موجود ہے، اسی سے چند اقتباسات علامہ شبلیؒ نے اپنی کتاب سیرۃ النبیؐ میں لئے ہیں۔ اس کی جو بات یہاں نقل کرنا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں انصار کی ایک ایک شاخ کا نام لے کر یہ لکھا گیا: "علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم" کہ حسب سابق یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کا دیت کا بوجھ اٹھاتے رہیں گے۔ اور ضرورت پڑنے پر اپنے قیدی کو بھی چھڑواتے رہیں گے۔ پھر یہودیوں کی ایک ایک شاخ کا نام لے کر ان کو شریک معاہدہ قرار دیا گیا۔

قدیم نظام دیت کی بنیاد سوفی صد تعاون علی البر والتقویٰ پر تھی۔ یہ امداد باہمی کی ایک نہایت عمدہ شکل تھی، جو آج بھی اسلامی شریعت کی رُو سے باقی ہے۔ ہوسکتا ہے

کہ اسی کو دیکھ کر یورپ میں ''التأمین التجاری'' کا سلسلہ شروع کیا گیا ہو۔ ایک روایت تو یہ ہے کہ جب اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، انہوں نے امداد باہمی کے اصول اور جذبہ کے تحت بحری تاجروں کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کی بنیاد ڈالی۔ دوسری روایت کے مطابق اٹلی کے تاجروں نے اس کا آغاز کیا۔ بہرحال کم وبیش چھ سو سال پہلے یہ بیمہ (INSURANCE) کا سلسلہ جاری ہوا اور یہ بات یقینی ہے کہ اس کی بنیاد نیک جذبات پر تھی..... مگر خانہ خراب ہو اس یہودی تمدن کا کہ وہ لوگ ہر بات کو Commercial Point of View یعنی کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھتے اور سوچتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس مفید اور جائز پروگرام میں ترمیم کر ڈالی اور جس چیز کا مقصد، مخلوق خدا کو نفع پہنچانا تھا، اسے آمدنی کا ذریعہ بنا ڈالا۔ موجودہ انشورنس (بیمہ) انہی کے ناپاک ذہن کی پیداوار ہے۔ الاستاذ ابوزھرہ فرماتے ہیں:

''ان التأمین کان تعاونیا، و لکن الیهود الذین استووا علی الاقتصاد بعد عصر..... قد حولوه من التعاون الی الاستغلال الواضح.'' (عقود التأمین)

ترجمہ:..... ''بیمہ شروع میں امداد باہمی کی ایک شکل میں نمودار ہوا۔ لیکن جب ایک زمانہ کے بعد یہودیوں کا اقتصادیات پر تسلط ہوگیا، تو انہوں نے اسے امداد باہمی سے نکال کر واضح کمائی کے ذریعے میں بدل دیا۔''

اب آیئے، ایک نظر اس پر ڈال لیجئے کہ نظام دیت اور لائف انشورنس (بیمہ زندگی) میں کیا فرق ہے؟

لائف انشورنس (بیمہ زندگی)	اسلامی نظام دیت
۱:.....جو شخص اپنی زندگی کا بیمہ کرانا چاہے، پہلے وہ بیمہ کمپنی کے مقررہ ڈاکٹر سے اپنا میڈیکل چیک اپ (طبی معائنہ) کرائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اگر کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو کتنا عرصہ مزید وہ زندہ رہ سکتا ہے۔	اس طرح کا کوئی سوال نہیں
۲:.....کمپنی اور بیمہ کرانے والے کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے جس میں طے پاتا ہے کہ اتنے سالوں میں وہ شخص کمپنی کو اتنی رقم ادا کرے گا۔ اس رقم کو پالیسی اور بیمہ کرانے والے کو ''پالیسی ہولڈر'' کہا جاتا ہے۔	اس طرح کا کوئی سوال نہیں
۳:.....پالیسی کی رقم کی اقساط بن جاتی ہیں، ہر قسط کو پریمیم Premium کہا جاتا ہے۔	اس طرح کا کوئی سوال نہیں
۴:.....اگر پالیسی ہولڈر، چند اقساط کے بعد رقم جمع کرانا بند کردے، تو سابقہ جمع شدہ رقم سوخت (Lapse) ہوجاتی ہے۔	اس طرح کا کوئی سوال نہیں
۵:..... اگر مقررہ مدت کے اندر پالیسی ہولڈر مرجائے تو طے شدہ رقم اس کے وارثوں کو ملے گی، خواہ اس نے چند ہی قسطیں جمع کرائی ہوں۔	اس طرح کا کوئی سوال نہیں
۶:.....اگر مقرر مدت کے ختم ہوجانے کے بعد بھی پالیسی ہولڈر زندہ رہ جائے تو پالیسی کی جمع شدہ رقم مع سود اسے مل جائے گی۔	

اب آپ غور فرمایئے، نظام دیت میں سوسائٹی کے ہر فرد کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، خواہ وہ کتنا غریب کیوں نہ ہو۔ اس کے برخلاف بیمہ زندگی وہی شخص کرا سکتا ہے جو باقاعدگی سے پریمیم ادا کر سکتا ہو۔

(ب) شق نمبر ۴ کو دیکھئے، اگر ایک شخص نے پالیسی لے لی، مگر بعد میں وہ اس کاروبار کو ناجائز سمجھ کر یا اپنے مالی حالات کے مدنظر اس کو بند کرنا چاہتا ہے، تو کمپنی جمع شدہ رقم ضبط کر لیتی ہے۔ یہ صریح اکل اموال الناس بالباطل (یعنی ناحق کسی کا مال کھا جانا) ہے۔

(ج) شق نمبر ۵ کو دیکھئے، آدمی یہ معاملہ اسی توقع پر کرتا ہے کہ تھوڑی سی رقم لگا کر زر خطیر حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسے قمار اور عرف میں لاٹری (LOTTERY) کہا جاتا ہے۔

(د) شق نمبر ۶ کو دیکھئے، ظاہر ہے کہ اس میں تو سود کی لعنت موجود ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

ہو سکتا ہے کہ، جیسا کہ علماء پر عموماً تنگ نظر اور حالات زمانہ سے بے خبر ہونے کی پھبتی کسی جاتی ہے، بلکہ اگر اعتراض کرنے والے کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہو تو ''دقیانوسی مُلّا'' کی گالی بھی دی جاتی ہے، اس وقت کوئی قاری، راقم السطور کو بھی اس سلوک کا مستحق قرار دے تو ہم پیشگی عرض کئے دیتے ہیں کہ موجودہ دور کی انشورنس جس میں سود کا پہلو نمایاں ہے، کیا اللہ کے رسول (ﷺ) اور خلفاء راشدین کی جلیل القدر ہستیوں سے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسے معاملہ کو جائز قرار دیں، جس کے بارے میں اللہ رب العزت کی طرف سے یہ وعید آ چکی ہو؟

"فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ" (سورۂ بقرہ:۲۷۹)

ترجمہ: اگر تم باز نہ آئے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔

ایک اور تقاضائے احتیاط:

اللہ نے اور اللہ کے رسول (ﷺ) نے تو منہ سے ایسی بات نکالنے کی رکاوٹ کردی ہے جس سے باطل کو حق میں شامل ہوجانے کی راہ ملتی ہو۔ چند مثالیں دیکھئے:

۱:.....قرآن پاک، سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۴ میں فرمایا گیا:

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوْا انْظُرْنَا"

ترجمہ: اے ایمان والو! تم "رَاعِنَا" نہ کہا کرو اور "اُنْظُرْنَا" کہا کرو۔

قصہ یوں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ، صحابۂ کرام سے کچھ ارشاد فرماتے تو بعض صحابہؓ عرض کرتے راعنا یعنی حضور! ہماری بھی رعایت فرمائیے۔ بدبخت یہودی اس لفظ کو بگاڑ کر اپنے دل میں اور معنیٰ مراد لیتے یا تو وہ اس کو راعینا پڑھتے (یعنی او ہمارے چرواہے) یا پھر راعن کے لفظ کو رعونہ سے مشتق تصور کر کے بولتے۔ ہر صورت میں شان اقدس میں گستاخی کا پہلو نکلتا۔ نعوذ باللہ، صحابہؓ کے دل میں تو ایسی کوئی بات قطعاً نہ ہوتی، لیکن اللہ کی ذات علیم بذات الصدور تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس لفظ کے استعمال سے یہودیوں کی بدباطنی کیا رنگ دکھاتی ہے۔ اس لئے اس لفظ کی رکاوٹ فرمادی گئی اور حکم دیا گیا کہ مسلمانو! تم آئندہ انظرنا (ہماری طرف توجہ فرمائیے) کہا کرو۔

۲:.....عربوں میں رواج تھا کہ وہ انگور کو الکرم کہا کرتے تھے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے

تھے کہ انگوروں سے شراب تیار ہوتی ہے اور شراب خور آدمی طبعاً فیاض اور سخی ہوتا ہے اور کرم کے معنیٰ ہیں سخاوت، فیاضی۔ تو جب شراب حرام ہوگئی تو انگور کو الکرم کہنے کی ممانعت فرمادی گئی تاکہ انگور کا نام لیتے ہوئے شراب کی تعریف کا پہلو سامنے نہ آئے۔
(دیکھئے صحیح مسلم ص:)

۳:..... اگر کسی آدمی کی طبیعت بدمزہ ہورہی ہو تو عربی زبان میں اس کے لئے ایک تو لفظ آتا ہے لقست نفسی دوسرا لفظ ہے خبثت نفسی۔ حدیث شریف میں دوسرے لفظ کے استعمال کی رکاوٹ فرمائی گئی کیونکہ خبثت سے ایک اور معنیٰ بھی نکل سکتے ہیں کہ خباثت، جو ایک نہایت بری صفت ہے، اس کا اپنی طرف نسبت کرنا، آداب گفتگو کے خلاف ہے۔ (بخاری و مسلم)

اس سلسلہ میں اور بھی کئی مثالیں کتب حدیث سے پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن ہم انہی پر اکتفاء کرتے ہوئے عرض گزار ہیں کہ ایک طرف شریعت مطہرہ کا یہ درس احتیاط، دوسری طرف جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی یہ فراخ دلی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے ایک عمل کو ایسے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، جو غلیظ اور ناپاک معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور جس سے ایک غلیظ کاروبار کو مفاد پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ راقم السطور اور کسی کی بات نہیں کرتا، خود میرے ساتھ ہی یہ واقعہ ہوا کہ میرا ایک پڑھا لکھا عزیز، جو لائف انشورنس کے کام سے وابستہ ہے، انشورنس کے جواز کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کے خطبات سے دو صفحے فوٹو اسٹیٹ کرالایا۔

زاد المعاد کے اردو ترجمہ از رئیس احمد کا سرسری جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحاج حبیب الرحمٰن خاں (خان بہادر) مرحوم، راقم السطور کے ایک کرم فرما تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرانے گریجویٹ تھے۔ دینی اقدار سے محبت انہیں ورثے میں ملی تھی، اسی چیز نے اخیر عمر میں انہیں شیخ العصر حضرت مولانا خان محمد صاحب مدظلہم کی بارگاہ رشد و ہدایت تک پہنچایا تھا۔ مذہبی کتب کے مطالعہ سے ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی دن خالی رہا ہوگا۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے سیرت طیبہ کی ایسی کتاب کے بارے میں دریافت کیا جو رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہو، علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبیؐ وہ بارہا دیکھ چکے تھے۔ میں نے انہیں علامہ ابن القیمؒ کی زاد المعاد کا پتہ دیا۔ رئیس احمد جعفری کا کیا ہوا ترجمہ، نفیس اکیڈمی کراچی کی طرف سے تازہ بازار میں آیا ہوا تھا۔ مرحوم نے فوراً یہ ترجمہ خرید کر اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ اپنی پسند یا ناپسند کے بارے میں تو انہوں نے کبھی میرے سامنے کوئی اظہار رائے نہ کیا، لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ترجمہ کے پہلے دو حصے مجھے دے دیئے، یہ دونوں حصے ایک عرصہ تک یوں ہی میرے پاس رکھے رہے۔ کبھی ان کو اٹھا کر دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک دن فرصت کے چند لمحات گزارنے کے لئے جلد اول میں نے ہاتھ میں لی، بعض بعض جگہ محسوس ہوا کہ ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا، اس کے بعد میں نے عربی نسخہ نکالا، اب جو اردو ترجمہ کا اس سے موازنہ

کیا تو میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ راقم کو جعفری صاحب کے بارے میں حسن ظن تھا کہ ایک تو وہ علم حدیث میں حضرت مولانا حیدر حسن خاںؒ جیسے جلیل القدر عالم کے شاگرد ہیں، ثانیاً وہ ندوی ہیں، اس لئے ان کا علم بھی قابل اعتماد ہوگا، اور قلم بھی، مگر اب پتہ چلا کہ: خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔

جعفری صاحب اپنی تصنیفی کاوشوں کو ناول نویسی اور زیادہ سے زیادہ سوانح نگاری تک محدود رکھتے تو بہتر ہوتا۔ حدیث یا سیرت طیبہ کی کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگاتے: تم یہ احساں جو نہ کرتے، تو احساں ہوتا۔

حدیث کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے ان کا کیا مقام تھا؟ خدا گواہ ہے کہ محض جذبۂ: ''الدین النصیحة'' کے تحت، راقم ان کے بارے میں یہ ریمارکس دینے پر مجبور ہے:

الف:..... جعفری صاحب علم حدیث میں اتنی بھی قابلیت نہیں رکھتے، جتنی کہ مشکوٰۃ پڑھنے والے ایک ذی استعداد طالب علم سے توقع کی جاسکتی ہے۔

ب:..... وہ علمی اصطلاحات سے ناآشنا ہیں، اس لئے ترجمہ میں مضحکہ خیز غلطیاں کر گزرتے ہیں۔

ج:..... وہ عربی زبان بھی پوری طرح نہیں جانتے، صرف ونحو کے بارے میں ان کی استعداد بالکل سطحی سی ہے۔

د:..... ایک علمی کتاب کے ترجمہ میں مترجم کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں، جعفری صاحب قطعاً ان کو ملحوظ نہیں رکھتے، اس لئے ترجمہ میں غلطیاں آجانے سے کتاب کے بیش بہا علمی افادات، پہیلیاں بن کر رہ جاتے ہیں۔

ہ:..... وہ صرف ترجمہ نہیں کرتے، بلکہ جگہ جگہ تلخیص بھی کردیتے ہیں،

پھر نہ تو اس کے لئے کوئی معیار قائم کرتے ہیں اور نہ قارئین کو اس سے آگاہ کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں انہیں ترجمہ میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے، وہاں وہ چند سطریں یا کہیں کہیں صفحے کے صفحے حذف کردیتے ہیں۔

و:..... زاد المعاد کے ترجمہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جعفری صاحب کا ''دین داری'' کا پہلو خاصا کمزور ہے، اس لئے وہ بعض اوقات فقہی مسائل کو نظر انداز کردیتے ہیں یا پھر متجددین زمانہ کی عام روش کے مطابق بڑے ہی وثوق کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار شروع کردیتے ہیں، جس کا ''ایاز! قدر خود بشناس'' کے تحت انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔

اگر جعفری صاحب آج بقید حیات ہوتے تو راقم السطور ان سے معذرت کرتا کہ ان کے بارے میں اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، خالصاً اسی جذبہ کے تحت لکھا گیا ہے، جس کے تحت اسماء الرجال کی کتب رواۃ حدیث کے بارے میں رد و قدح سے بھری ہوئی ہیں۔ واللہ علیم بذات الصدور۔

یہاں پر یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ جعفری صاحب کے ترجمہ کو بالاستیعاب دیکھنے کی نہ تو فرصت ہے، نہ ضرورت، جستہ جستہ دیکھنے سے جو غلطیاں سامنے آئیں، ان کی نشان دہی کردی گئی ہے، ورنہ تو کتاب کا کوئی سا صفحہ کھول کر دیکھ لیا جائے، دو چار غلطیاں ضرور ہی نکل آئیں گی:

کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے
کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غم جاناں

ذیل میں جعفری صاحب کے ترجمہ کی غلطیوں کی چند مثالیں درج ہیں:

۱:..... علامہ ابن قیمؒ، بلد الحرام (مکہ المکرمہ) کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قضاءِ حاجت کے وقت اس کی طرف رخ یا پیٹھ کرنا حرام ہے، اور زیادہ صحیح مذہب یہ ہے کہ: ''لا فرق فی ذلک بین الفضاء و البنیان'' یعنی اس بارے میں کھلے میدان اور عمارت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر جعفری صاحب ''البنیان'' کا ترجمہ ''بیابان'' سے کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ ''یہ پابندی ہر جگہ ہے خواہ وہ میدان ہو یا بیابان''۔ (ترجمہ اردو ص:۴۲)

۲:..... مصنف زاد المعاد، آنحضرت ﷺ کا نسب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''و لا خلاف بینهم ان عدنان من ولد اسمٰعیل علیه السلام، و ان اسمٰعیل هو الذبیح علی قول الصواب عند علماء الصحابة و التابعین و من بعدهم. و اما القول بانه اسحق، فباطلٌ.''

صحیح ترجمہ: علماءِ انساب میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عدنان، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت اسمٰعیلؑ ہی ذبیح ہیں۔ صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور بعد کے علماءِ کے نزدیک یہی قول صحیح ہے اور یہ کہنا کہ حضرت اسحٰق ذبیح ہیں، غلط ہے۔

جعفری صاحب کا ترجمہ:

''اور یہ (عدنان) حضرت اسمٰعیل الذبیح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور جمہور علماءِ کرام کی یہی تحقیق ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ اسحٰق علیہ السلام کی اولاد

میں سے تھے اور یہ غلط ہے۔" (ترجمہ اردو ج:۱ ص:۶۲)

ملاحظہ کیجئے! بات کچھ سے کچھ بنادی گئی ہے، مصنف جس اختلاف کا ذکر کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ ذبیح اللہ کون ہیں؟ حضرت اسمٰعیلؑ یا حضرت اسحٰقؑ؟ مگر جعفری صاحب اصل مسئلہ کو چھوڑ کر اسے لے بیٹھے کہ عدنان کس کی اولاد میں سے ہیں۔ حالانکہ کسی اپنے یا پرائے نے یہ نہیں لکھا کہ عدنان حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے نہیں ہیں، حضرت اسحٰقؑ کی اولاد میں سے ہیں۔

۳:.....آگے حضرت علامہ ابن قیمؒ مزید اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کون سے صاحبزادے "ذبیح" ہیں، اس سلسلہ میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے قول (وہ حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح مانتے ہیں) کی تردید کرتے ہوئے اپنے استاد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا ایک استدلال نقل کرتے ہیں:

"ان کا قول خود ان کی کتاب کی رو سے باطل ہے کیونکہ اس میں لکھا ہے: ان الله امر ابراهيم ان يذبح ابنه بكره و فى لفظ وحيده و لا يشك اهل الكتب مع المسلمين ان اسمٰعيل هو بكر اولاده."

اس عبارت کا صحیح ترجمہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ اپنے پہلوٹے بیٹے کو ذبح کریں، اور ایک روایت میں اکلوتے کا لفظ آیا ہے۔ اب مسلمانوں کے ساتھ اہل کتاب کو بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ ہی آپ کے پہلوٹے بیٹے ہیں۔ (لہٰذا وہی ذبیح ہوئے)

جعفری صاحب نے خط کشیدہ لفظ بکر کا ترجمہ غلط کر کے کیا گل کھلائے ہیں؟

قارئین ملاحظہ فرمائیں، وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ باوجود نہ چاہنے کے اپنے بیٹے کو اور ایک روایت کے مطابق اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کردیں، اب اہل کتاب اور مسلمان دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ان کی نرینہ اولاد ہیں۔'' (زاد المعاد اردو ج:۱ ص:۶۲)

جعفری صاحب نے پہلی جگہ بکرہ کو بِکْرُہٖ پڑھا اور معنیٰ غلط کردیا، دوسری جگہ بکر کا ترجمہ نرینہ سے کیا۔ تعجب ہے کہ نہ تو حضرت کے سامنے کوئی لغت تھی کہ اسے اٹھا کر بکر کا ترجمہ دیکھ لیتے، نہ پھر آگے کتاب میں انہیں یہ جملہ نظر آیا کہ ''بکر الاولاد احب الی الوالدین عمن بعدہ'' (یعنی پہلوٹی اولاد والدین کے نزدیک بعد والی سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ بندۂ خدا نے یہ نہ سوچا کہ بکر کا ترجمہ نرینہ ہوتو پھر من بعدہ کا کیا مطلب ہوگا)۔ پھر یہ بھی نہ سوچا کہ حضرت اسحٰقؑ بھی تو بیٹے اور نرینہ اولاد تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو بکر کہنے کی تخصیص کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

۴:..... ازواج مطہراتؓ کے ذکر میں حضرت عائشہؓ کے حالات میں حافظ ابن قیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

''و قیل : انها اسقطت من النبی صلی الله علیه و سلم سقطاً، و لم یثبت.''

اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: بعض لوگ کہتے ہیں کہ بی بی صاحبہ کا آنحضرت

ﷺ سے ایک حمل ساقط ہوا تھا، مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

جعفری صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں اور عربی زبان کے ساتھ تاریخ نبوت کا بھی خون کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

''ایک روایت کے مطابق نبی ﷺ نے ان سے کچھ دیر کے لئے مقاطعہ کیا تھا، لیکن یہ روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔'' (ص:۹۰)

۵:..... ام المؤمنین حضرت ام حبیبہؓ کا حال لکھتے ہوئے، حافظ ابن قیمؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ عقد حضرت ابوسفیانؓ کی درخواست پر ہوا تھا۔ پھر اس روایت پر علمی بحث کی ہے، ترجمہ میں غلطیاں آجانے سے پوری بحث، چیستاں بن کر رہ گئی ہے۔ کتاب میں ایک جملہ ہے: ''و قد اکثر الناس الکلام فی هذا الحدیث، و تعددت طرفهم فی وجهه''۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے اس حدیث میں بڑی لے دے کی ہے اور اس کی توجیہ بیان کرنے میں مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ چنانچہ بعد میں مصنف نے چھ توجیہیں نقل کی ہیں۔ مگر جعفری صاحب علمی اصطلاحات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''اس روایت پر کافی جرح بھی کی گئی ہے اور اسناد میں بھی اختلاف ہے۔'' (ترجمہ اردو، ص:۹۴)

۶:..... آنحضرت ﷺ کے مکتوبات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: ''فاتخذ خاتماً من فضة'' یعنی خطوط پر مہر لگانے کے لئے آپؐ نے

چاندی کی ایک انگوٹھی بنوالی، مگر جعفری صاحب لکھتے ہیں: ''سونے کی انگوٹھی''۔

(ترجمہ ج:۱ ص:۱۰۰)

معلوم ہوتا ہے کہ جعفری صاحب کو ''فضة'' کا صحیح معنیٰ معلوم ہی نہیں تھا، وہ اور بھی کئی جگہ اس کا ترجمہ ''سونا'' سے کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ایک پیالے کے بارے میں کتاب میں لکھا ہوا ہے: ''مضبب بسلسة من فضة''۔ یہاں بھی وہ ''سونے کی زنجیر'' لکھتے ہیں۔ (ج:۱ ص:۱۰۹)

۷:..... آنحضرت ﷺ کے لباس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف علاّم، صحیح بخاری سے ایک روایت نقل کرتے ہیں: ''ان النبی صلی الله علیه و سلم نهیٰ عن المیاثر الحمر''۔ ''میاثر''، ''میثرہ'' کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں بچھونا یا وہ کپڑا جو خوشنمائی کے لئے گھوڑے وغیرہ کی زین پر ڈال دیا جائے، اور ''حمر''، ''حمراء'' کی جمع ہے بمعنیٰ ''سرخ''۔ صحیح ترجمہ یوں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سرخ بچھونوں سے رکاوٹ فرمائی ہے۔

مگر جعفری صاحب ''حمر'' (بسکون المیم) کو ''حمر'' (بضم المیم) پڑھتے ہیں، جو ''حمار'' کی جمع ہے اور آپ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''نبی ﷺ نے گدھوں کی سرخ کاٹھیوں سے منع فرمایا''۔ (ج:۱ ص:۱۱۳)

کرشمہ دیکھئے کہ بیک وقت حمر کا ترجمہ ''گدھوں'' سے بھی کررہے ہیں اور ''سرخ'' سے بھی۔ لفظ ایک ہے، معنیٰ دو۔ پھر یہ بھی نہیں دیکھتے کہ عربی عبارت کا خط کشیدہ لفظ مرکب توصیفی ہے نہ کہ مرکب اضافی۔

۸:..... کھانے پینے کے بیان میں مصنف تحریر فرماتے ہیں:

''و کان لا یاکل متکئاً، و الاتکاء علی ثلاثة

انواع، احدها: الاتکاء علی الجنب، و الثانی: التربع، و الثالث: الاتکاء علی احدی یدیه و اکله بالاخری، و الثلاث مذمومة."

اس کا صحیح ترجمہ: آپ سہارا لگا کر نہیں کھاتے تھے، سہارا لگانے کی تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ پہلو پر سہارا لے لے، دوسری: آلتی پالتی مار کر بیٹھنا، اور تیسری: ایک ہاتھ پر سہارا لے کر دوسرے سے کھانا، اور یہ تینوں صورتیں بری ہیں۔

مگر جعفری صاحب اس عبارت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

"آپ سہارا لگا کر نہیں کھاتے تھے، آپ تین طرح سے تکیہ لگاتے تھے، کبھی ایک طرف سہارا لگا کر بیٹھتے، کبھی پلتھی مار کر اور کبھی ایک ہاتھ سے سہارا لگاتے اور دوسرے سے کھاتے۔" (ج:۱ ص:۱۱۹)

جعفری صاحب کو نہ تو پیچھے اپنا لکھا ہوا "نہیں" کا لفظ یاد رہا، نہ آگے کتاب میں "و الثلاث مذمومة" لکھا نظر آیا اور یوں ایک غلط بات حضور اقدس ﷺ کی طرف منسوب کردی۔

۹:..... رات کو آرام فرمانے، بالخصوص دوران سفر پڑاؤ ڈالنے کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی سیرت کے ضمن میں ابوحاتم کی ایک روایت نقل کی گئی ہے: "کان اذا عرس باللیل توسد یمینه"۔ ترجمہ یہ ہے کہ جب آپؐ رات کو نزول فرماتے تو دائیں بازو کو تکیہ بنالیتے، مگر جعفری صاحب اس جملہ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: "آپؐ رات کو کسی منزل پر اترتے تو دائیں پہلو پر آرام فرماتے"۔ (ص:۱۲۷)

پھر دو تین جملے کے بعد کتاب میں یہ لکھا ہے کہ: ''و التعریس انما یکون قبیل الصبح''۔ یعنی تعریس رات میں اترنے کو نہیں کہتے، صبح سے تھوڑی دیر پہلے اترنے کو کہتے ہیں، مگر جعفری صاحب تعریس کا معنیٰ لکھتے ہیں ''اکڑوں بیٹھنا''۔ کاش ان سے دریافت کیا جاسکتا کہ حضرت! جو مسافر رات کو کسی جگہ اترتا ہے، کیا وہ اتر کر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے؟ آخر اس ترجمہ کی کیا تک بنتی ہے؟

۱۰:..... علامہ ابن قیمؒ کتاب میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ پانچ مواقع پر عورت کو مرد سے نصف حیثیت حاصل ہے، جن میں سے ایک عقیقہ ہے۔ اس جگہ جعفری صاحب نے فٹ نوٹ کی شکل میں حضرت مصنف کے خلاف اختلافی نوٹ دیا ہے، اس کے چند جملے قارئین کی ضیافت کے لئے نقل کئے جاتے ہیں:

> ''اگر کسی معاملہ میں مرد کو عورت پر تفوق حاصل ہے تو کسی معاملہ میں عورت، مرد پر تفوق رکھتی ہے، مثلاً پاکدامن عورت پر بدچلنی کا اتہام لگانے کی سزا اسّی کوڑے ہے، لیکن پاکدامن مرد پر بدچلنی کی تہمت پر یہ سزا نہیں ہے۔''
>
> (ج:۱ ص:۱۲۹ حاشیہ)

مدارس عربیہ میں ایک جملہ بولا جاتا ہے ''من لم یعرف الفقه، قد صنّف فیه کتاباً''۔ تعجب ہے کہ ایک شخص علم سے اتنا بے بہرہ اور جرأت یہ کہ شریعت کے طے شدہ مسائل میں ائمۂ دین کے برخلاف رائے زنی کی جارہی ہے۔ معلوم نہیں حد قذف کے مسئلہ میں عورت اور مرد کا فرق جعفری صاحب نے کہاں سے نکال لیا۔ اسی پر صادق آتی ہے، مثل: ''انفٌ فی الماء و استٌ فی السماء''

۱۱:.....ایک مقام پر کتاب میں یہ الفاظ آئے ہیں: ''اتی سباطة قوم، و هو ملقی الکناسة، و یسمی المزبلة''۔

اس کا صحیح ترجمہ: آپ ﷺ لوگوں کی کوڑی کے پاس آئے اور کوڑی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہو، اور اس کو عربی میں ''مَزْبَلَة'' بھی کہا جاتا ہے۔

جعفری صاحب نے اس موقع پر حد کردی ہے، غلطی نہیں بلکہ ''غلطاڑ'' کے مرتکب ہوئے ہیں، لکھتے ہیں: ''آپؐ ایک کوڑے کے ڈھیر کے پاس تشریف لائے، آپؐ مزبلہ نام کی چادر اوڑھے ہوئے تھے''۔ (ج:۱ ص:۱۳۸)

لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ کناسہ کے معنیٰ چادر کے کردیئے اور مزبلہ اس کا نام تجویز کرلیا۔ یوں عربی زبان کا بھی ستیاناس کیا اور سیرت نگاری کا بھی۔

۱۲:..... کتاب میں اس مسئلہ پر مبسوط بحث ہے کہ مونچھوں کو کتروانا چاہئے یا منڈوانا۔ اس سلسلہ میں حافظ ابن القیمؒ نے حضرت امام مالکؒ کا ایک قول نقل کیا ہے: ''و ارٰی ان یُؤدَّبَ مَن حَلَّق شاربه''۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ''میری رائے میں جو شخص مونچھیں منڈوائے، وہ تنبیہ اور تادیب کا مستحق ہے''۔ مگر جعفری صاحب اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''اور میں سمجھتا ہوں کہ مونچھیں مناسب طریقہ سے بنائے''۔ (ج:۱ ص:۱۴۱) سبحان اللہ!

اسی بحث میں جعفری صاحب نے ایک اور بڑا دلچسپ لطیفہ پیدا کیا ہے، مصنف لکھتے ہیں: ''و احتج المحفون باحادیث الامر بالاحفاء''۔ یعنی جو لوگ مونچھیں منڈوا دینے کے قائل ہیں، وہ ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں اِحْفَاء (مونڈنے) کا حکم آیا ہے۔ آپ نے خط کشیدہ لفظ کو دیکھا ہے، یہ اِحْفَاء سے

اسم فاعل کا صیغہ ہے، مگر جعفری صاحب یہ سمجھے کہ یہ کسی محدث یا فقیہ بزرگ کا نام ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اور محفون نے اس حدیث سے دلیل پیش کی ہے.....''

(ج:۱ ص:۱۴۲)

کتابت کی غلطی سے محفون کی بجائے مظعون لکھا گیا ہے یا ممکن ہے یہ تصحیح بھی جعفری صاحب نے فرمادی ہو۔

مدارس دینیہ میں ''امام توقان'' کا لطیفہ پہلے سے چل رہا تھا، اب امام محفون.....یا مظعون.....کا تعارف جعفری صاحب نے کرادیا ہے۔

۱۳:.....کتاب میں آنحضرت ﷺ کا خطبہ نقل کرتے ہوئے لکھا گیا ہے: ''خیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ و سلم''۔ جعفری صاحب خط کشیدہ لفظ کا ترجمہ کرتے ہیں: ''بہترین تحفہ''۔ (ص:۱۴۶)، حالانکہ ''ھدی'' کے معنیٰ سیرت کے ہیں۔

انہیں اتنا بھی خیال نہیں رہا کہ جس کتاب کا وہ ترجمہ کررہے ہیں، اس کا پورا نام ''زاد المعاد فی ھدی خیر العباد'' ہے تو کم از کم اسی کا صحیح ترجمہ معلوم کرلیتے۔

۱۴:.....وضوء کے بیان میں مصنف فرماتے ہیں: ''و کان یغسل رجلیہ اذا لم یکونا فی خفین و لا جوربین .....الخ''۔ یعنی اگر آپؐ نے موزے نہیں پہنے ہوئے ہوتے تھے تو دونوں پاؤں کو دھوتے تھے، بصورت دیگر موزوں کا مسح فرمالیتے۔

جعفری صاحب کا ترجمہ پڑھئے اور ان کی علمی احتیاط اور دیانتداری کی داد دیجئے:

"اگر موزے نہ پہنے ہوتے یا پاتابے استعمال میں نہ ہوتے تو پورے پاؤں کا مسح کرتے، لیکن اگر پہنے ہوتے تو صرف موزوں کا مسح کر لیتے۔" (ج:۱ ص:۱۵۱)

۱۵:..... نماز چاشت کے بیان میں علامہ ابن القیمؒ مورق عجلی کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا: کیا آپ چاشت کی نماز پڑھا کرتے ہیں؟ کہا: نہیں، میں نے کہا: کیا حضرت عمرؓ پڑھا کرتے تھے؟ کہا: نہیں، میں نے کہا: تو حضرت ابوبکرؓ؟ کہا: نہیں، میں نے پوچھا: نبی اکرم ﷺ؟ کہا: "لا اخالہ"۔ یعنی میں ایسا خیال نہیں کرتا۔ اب یہ "اخالہ" واحد متکلم فعل مضارع معلوم کا صیغہ ہے، خیال سے مشتق ہے، مگر جعفری صاحب کا ترجمہ سنئے اور سر دھنئے، آپ فرماتے ہیں: "نہیں، وہ بھی نہیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں"۔ (ج:۱ ص:۲۲۷)

اللہ تعالیٰ انہیں معاف کرے، وہ یہ بھی نہ سوچ سکے کہ "ان کا کوئی بھائی نہیں" کہنے کی تک ہی کیا بنتی ہے؟

۱۶:..... حضرت مصنفؒ نے جمعہ کے بیان میں "وادیٔ مزید" کا ذکر قدرے بسط سے کیا ہے، چند جملے مع ترجمہ ملاحظہ ہوں:

"فیتجلّی لهم عز و جلّ، فیغشاهم من نوره شئ لو لا انه قضی ان لا یحترقوا لاحترقوا لما یغشاهم من نوره..... فیرجعون الی منازلهم و قد اعطی کل واحد منهم الضعف علی ما کانوا فیه.....الخ."

صحیح ترجمہ: تو اللہ تعالیٰ ان کے سامنے جلوہ افروز ہوں گے، اس کے نور سے کوئی چیز انہیں ڈھانپ لے گی۔ اگر یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا کہ وہ جلیں گے نہیں تو اس کے نور کے چھا جانے سے (تجلیات کی تاب نہ لاکر) بہشتی جل جاتے..... پھر وہ اپنے ٹھکانوں کو واپس ہوں گے اور ہر شخص کو پہلے سے دوگنی نعمتیں مل چکی ہوں گی۔

اب جعفری صاحب کی گل کاریاں ملاحظہ ہوں، لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ ان کے سامنے منکشف ہوجا ہے تو وہ ذرا سی جھلک دیکھتے ہی غش کھا جاتے ہیں، جب ان کو غش آتا ہے تو اگر ان کے متعلق یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ نہ جلیں تو ضرور جل جاتے..... پھر وہ لوگ اپنے منازل کو واپس آجاتے ہیں، اس واقعہ کے باعث ان پر ضعف طاری ہوجاتا ہے۔''

(ج:۱ ص:۲۵۲)

جعفری صاحب کے معلومات کا دائرہ کتنا تنگ ہے، انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جنت میں کوئی کمزور نہیں ہوگا۔

۱۷:..... آغاز نماز جمعہ کے سلسلہ میں مصنف نے آنحضرت ﷺ کا پہلا خطبہ نقل کیا ہے، اس میں ایک جملہ ہے: ''ثم لیدعن غنمه لیس لها راع'' یعنی جس روز قیامت قائم ہوگی تو آدمی اپنی بکریوں کو چھوڑ دے گا، کوئی ان کا چرانے والا نہ ہوگا۔ جعفری صاحب ترجمہ کرتے ہیں: ''وہ اپنی بکریوں کو بلائے گا''۔ (ص:۲۵۳)

۱۸:..... بچوں کی نماز جنازہ کے ضمن میں حافظ ابن قیمؒ، صاحبزادہ حضرت ابراہیم کے بارے میں ایک روایت لاتے ہیں:

"و ذکر عطاء بن ابی رباح "ان النبی صلی الله علیه و سلم صلّٰی علی ابنه ابراهیم و هو ابن سبعین لیلةً و هذا مرسل، و هم فیه عطاء فانه قد کان تجاوز السنة."

صحیح ترجمہ: عطاءؒ بن ابی رباح (تابعی) سے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی نماز جنازہ پڑھی تھی، جب کہ وہ ستّر دن کے تھے۔ یہ روایت مرسل ہے۔ اس میں عطاءؒ کو مغالطہ ہوا ہے کیونکہ وہ (حضرت ابراہیم) ایک سال سے تو تجاوز کر چکے تھے۔

جعفری صاحب کا ترجمہ پڑھئے اور ان کی حدیث دانی کی داد دیجئے، فرماتے ہیں:

"حضرت عطاءؒ بن ابی رباح سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے بیٹے کا جنازہ پڑھا جب کہ ان پر صرف ۱۷ راتیں گزری تھیں، یہ روایت بھی مرسل ہے اور اس میں ایک راوی عطاءؒ ہیں، اور یہ عمر میں تجاوز کر چکے تھے۔" (ص:۳۴۷)

ایک تو سبعین کا ترجمہ ستّر کی بجائے سترہ غلط کیا گیا ہے، دوسرا جعفری صاحب کو یہی معلوم نہیں کہ "مرسل" کسے کہتے ہیں؟ اسی لئے لکھتے ہیں کہ اس میں ایک راوی عطاءؒ ہیں، یہ روایت بھی مرسل ہے میں "بھی" کا لفظ بالکل غلط بڑھایا گیا ہے۔ عبارت کے آخری خط کشیدہ جملہ کا ترجمہ بھی صریحاً غلط ہے۔

۱۹:..... اسی صفحے پر جعفری صاحب نے ایک اور کمال کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں نے جابر جعفی کی روایت کے ذریعہ
حضرت براءؓ کی حدیث کو.....ضعیف قرار دیا ہے۔''

اگر جعفری صاحب کو علم حدیث اور اسماء الرجال سے کوئی مناسبت ہوتی تو انہیں معلوم ہوتا کہ ''جابر جعفی'' کیسے ''بزرگ'' ہیں اور کیا ان کی روایت بھی اس قابل ہوسکتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں حضرت براءؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی روایت کو ضعیف قرار دیا جاسکے؟ حد تو یہ ہے کہ جعفری صاحب نے دو سطر پہلے یہ نہیں دیکھ لیا کہ جابر جعفی حدیث براءؓ بن عازب کا راوی ہے اور ابن قیمؒ یہاں پر یہی کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ حضرت براءؓ کی روایت میں جابر جعفی کا واسطہ ہے، اس لئے بعض علماء نے اس روایت کو ضعیف اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔

۲۰:..... کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے: ''لم یکن من هديه: ان يبعث سعاته الا الى اهل الاموال الظاهرة من المواشى و الزروع و الثمار''۔ یعنی آپ کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ اموال ظاہرہ، جانوروں، فصلوں اور پھلوں کے مالکوں کے علاوہ کسی کے پاس اپنے عاملوں کو بھیجتے۔

جعفری صاحب اِلّا حرف استثناء کو نظر انداز کر کے بات کو بدل دیتے ہیں، ان کا ترجمہ یوں ہے: ''اور آپ کا یہ طریقہ تھا کہ عاملین کو چوپایوں، پھلوں اور فصلوں جیسے ظاہری اموال کے مالکوں کی طرف بھیجتے تھے''۔ (ص:۳۵۹)

کتاب الحج کے مباحث جو اصل کتاب میں ڈیڑھ سو سے زیادہ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ترجمہ جعفری صاحب کے دل پر بڑا بوجھ بن گیا تھا، درمیان میں صفحوں کے صفحے چھوڑ دیئے ہیں، ان کے ترجمہ کی زحمت ہی

گوارا نہ فرمائی، پھر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بھی جعفری صاحب کی نظر کرم کا نتیجہ ہے یا ناشر، نفیس اکیڈمی کی عنایت، کہ کتاب کے باقی ماندہ مضامین کا ترجمہ آگے پیچھے کردیا گیا، اس بے ربطی اور بے ترتیبی کا سرسری اندازہ لگانے کے لئے درج ذیل جدول کو دیکھئے۔

ہمارے سامنے اصل کتاب زاد المعاد کا وہ نسخہ ہے جو امیر فہد بن عبدالعزیز نے اپنے زمانۂ ولی عہدی میں طبع کرا کے مفت تقسیم کرایا تھا:

اصل کتاب زاد المعاد، الجزء الاوّل				ترجمہ اردو، حصہ اوّل			
صفحات	۳۵۵	تا	۴۱۴	صفحات	۴۳۵	تا	۴۴۷
"	۴۱۴	تا	۴۵۸	"	۴۲۲	تا	۴۳۴
"	۴۵۹	تا	۴۷۷	"	۴۰۳	تا	۴۲۱

مضامین میں حذف و اختصار کے ساتھ اس بے ترتیبی کی وجہ سے جو گڑبڑ پیدا ہوئی ہے، اس کا اندازہ کچھ اہل علم ہی لگا سکتے ہیں۔

اب چند ایک مثالیں کتاب کے حصۂ دوم سے پیش کی جاتی ہیں۔

۱:..... حافظ ابن قیمؒ نے حضرت علیؓ کے قبول اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"و کان فی کفالة رسول الله ﷺ، اخذه من عمه ابی طالب اعانةً له فی سنة محلٍ."

صحیح ترجمہ یہ ہے: وہ رسول اللہ ﷺ کی سرپرستی میں تھے، آپؐ نے انہیں اپنے چچا ابوطالب سے لے رکھا تھا، تاکہ قحط کے سال میں ان کی امداد ہوجائے۔

جعفری صاحب اس عبارت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''یہ رسول اللہ ﷺ کی کفالت میں تھے، انہیں آپ نے اپنے چچا سے تربیت کرنے کے لئے لے لیا تھا۔''

(ج:۲ ص:۹۶)

۲:..... مصنف فرماتے ہیں: ''فصار ختان اسحاق سنة فی ولده، و ختان اسمٰعیل سنة فی ولده''۔

صحیح ترجمہ: تو حضرت اسحٰقؑ کا ختنہ، ان کی اولاد میں دستور بن گیا اور حضرت اسمٰعیلؑ کا ختنہ ان کی اولاد میں رائج ہوگیا۔

جعفری صاحب کا ترجمہ: ''اسحٰق علیہ السلام کا ختنہ بچپن میں ہوا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ختنہ بھی بچپن میں ہوا''۔ (ج:۲ ص:۱۷)

مزے کی بات تو یہ ہے کہ جعفری صاحب اوپر لکھ چکے ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ کا ختنہ ساتویں دن اور حضرت اسمٰعیلؑ کا ختنہ تیرھویں سال میں ہوا۔ نہ اس لکھے ہوئے کا لحاظ کیا اور نہ عربی زبان کو سمجھ سکے۔

۳:..... حضرت زیدؓ بن حارثہ کے والد اور چچا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر جو گزارش کی تھی، اس میں ایک جملہ ہے: ''و تفکون العانی'' یعنی تم لوگ قیدی کو چھڑوالیتے ہو، مگر جعفری صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''آپ مسکین کی مدد کرتے ہیں''۔ (ج:۲ ص:۹۷)

اس واقعہ میں آگے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے زیدؓ بن حارثہ کا ایثار دیکھا تو ''اخرجه الی الحجر'' یعنی آپؐ اسے حطیم کی طرف لے کر گئے اور

فرمایا: ''میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ زید میرا بیٹا ہے''۔

جعفری صاحب ''اخرجه الی الحجر'' کا ترجمہ کرتے ہیں: ''انہیں دامن میں لے لیا''۔ (ج:۲ ص:۹۷)

۴:..... ہجرت حبشہ کے بیان میں حضرت مصنف لکھتے ہیں: ''و خرجوا متسللین سرا''۔ یعنی مہاجرین چھپ چھپ کر نکلے۔ جعفری صاحب ''متسللین'' کا ترجمہ کرتے ہیں: ''مسلح حالت میں''، جو بالکل غلط ہے۔ ''یتسللون'' کا لفظ قرآن مجید (سورۂ نور:۶۳) میں آیا ہے، کوئی سا ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیجئے، اور پھر جعفری صاحب کی عربی دانی کی داد دیجئے۔

۵:..... زاد المعاد میں لکھا ہے کہ جب صحابۂ کرامؓ، حبشہ گئے اور پیچھے سے قریش کے ایلچی اپنی مہم پر پہنچے تو نجاشی (شاہ حبشہ) نے حضرت جعفرؓ کی تقریر سن کر ان ایلچیوں سے کہا:

''لو اعطیتمونی دبرا من ذهب..... یقول جبلا من ذهب..... ما اسلمتهم الیکما''.

یعنی اگر تم مجھے سونے کا ایک پہاڑ بھی لاکر دے دو، میں انہیں تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ دبرا کی تشریح علامہ ابن قیمؒ نے خود ہی کردی ہے جبلاً یعنی پہاڑ، مگر جعفری صاحب نے دبرا (بالباء الموحدة) کی بجائے دیراً (بالیاء المثناة) پڑھا اور مصنف کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے ترجمہ یوں کیا: ''اگر تم مجھے سونے کا گرجا بلکہ پہاڑ بھی دے دو.....''۔ (ج:۲ ص:۱۰۱)

۶:..... ہجرت مدینہ کے ضمن میں مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ جب قریش،

حضورؐ کی تلاش میں نکلے تو ''اخذوا معهم القافة'' انہوں نے قیافہ شناسوں (سراغ رسانوں) کو اپنے ساتھ لے لیا تھا، مگر جعفری صاحب اپنی قابلیت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: ''انہیں فاقہ تک بھی سہنا پڑا''۔ (ج:۲ ص:۱۱۷)

۷:..... تحویل قبلہ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ مدینہ میں پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنانے اور پھر بیت اللہ کی طرف پھیر دینے میں ''حکم عظیمة'' بڑی حکمتیں ہیں، جعفری صاحب فرماتے ہیں: ''ایک عظیم حکم تھا''۔ (ج:۲ ص:۱۲۶)

۸:..... یہود بنی قینقاع، جن کو ان کی عہد شکنی اور بدباطنی کی سزا کے طور پر مدینہ بدر کیا گیا تھا، ان کے بارے میں زاد المعاد میں لکھا ہے: ''و کانوا صاغة و تجارا''۔ یعنی وہ لوگ زرگر اور تجارت پیشہ تھے، یہ صاغة کا لفظ صائغ کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں سنار، مگر جعفری صاحب لکھتے ہیں: ''یہ لوگ صنعت کار اور تجار تھے''۔ (ج:۲ ص:۱۵۵)

۹:..... فضیلت جہاد کے سلسلہ میں مصنف نے ایک حدیث شریف نقل کی ہے: ''غدوة فی سبیل الله او روحة خیر من الدنیا و ما فیها''۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ''اللہ کے راستے میں صبح کو نکلنا یا شام کو نکلنا، دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے''۔ مگر جعفری صاحب خط کشیدہ الفاظ کا ترجمہ کرتے ہیں: ''اللہ کے راستہ میں جانا اور آنا''۔ (ج:۲ ص:۱۴۳)

یہ حدیث، تبلیغی جماعت والے بھی اکثر اپنے بیانات میں سنایا کرتے ہیں اور کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا کیا وجہ ہے کہ متجددین حضرات کے لئے تختۂ مشق بن گئی ہیں۔

اب سے چودہ، پندرہ سال پیشتر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کی طرف

سے ایک کتاب ''الصلوات الفاخرة بالاحادیث المتواترة'' مع اردو ترجمہ شائع ہوئی تھی، اصل کتاب علامہ حامد دمشقیؒ صاحب فتاویٰ حمادیہ کی ہے، اور ترجمہ ڈاکٹر صغیر حسن معصومی، پروفیسر اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد، کی طرف سے ہے۔ معصومی صاحب بھی، جعفری صاحب کے ''جڑواں بھائی'' معلوم ہوتے ہیں۔ ترجمہ میں مضحکہ خیز غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ میں نے ۱۹۸۲ء میں ایک خط کے ذریعے انہیں توجہ دلائی تھی، جس کی رسید بھی ان کی طرف سے آگئی تھی، مگر پھر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ انہوں نے تلافی کی کیا صورت نکالی۔

مندرجہ بالا حدیث اس کتاب میں نمبر ۱۷ پر درج ہے، اول تو اس کے لفظوں میں مختصر سی ترمیم کردی گئی ہے، لکھا ہے: ''غزوة فی سبیل الله .....الخ''، اور پھر ترجمہ میں کمال کردیا ہے، فرماتے ہیں: ''اللہ کے راستے میں جنگ کرنا یا آرام کرنا، دنیا اور دنیا کی ساری اشیاء سے بہتر ہے''۔ تبھی تو کہنے والے نے کہا تھا: گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا، کار طفلاں تمام خواہد شد۔

۱۰:..... ایلچیوں اور سفیروں کے بارے میں علامہ ابن قیمؒ، آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ نقل کرتے ہیں کہ آپؐ ایلچیوں کو اپنے پاس نہیں روک لیتے تھے، خواہ وہ اسلام بھی قبول کرلیتے۔ چنانچہ ابو رافع نامی ایک شخص قریش کے سفیر بن کر حضورؐ کے پاس گئے، وہاں جاکر انہوں نے اسلام بھی قبول کرلیا اور اب کہنے لگے حضور! میں ان کے پاس واپس نہیں جاتا۔ آپؐ نے فرمایا: ''لا اخیس بالعهد و لا احبس البرد''۔ نہ میں عہد شکنی کروں گا اور نہ سفیروں کو روکوں گا۔ یہ برد کا لفظ برید کی جمع ہے جس کے معنیٰ ہیں ایلچی، قاصد۔ مگر جعفری صاحب کمال علم کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ ترجمہ کرتے ہیں: ''اور نہ چادر کو روکوں گا''۔ (ج:۲ ص:۱۶۳) کیا مطلب؟

۱۱:.....غزوۂ بدر کے بیان میں ترجمہ جگہ جگہ سے غلط ہے، ایک جگہ لکھا ہے کہ ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کی تلاش میں نکلنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے زیادہ نفری نہ جمع کی، آپ صرف تین سو دس اوپر چند آدمی لے کر جلدی سے نکل پڑے تھے۔ ''لم یحتفل لها احتفالاً بلیغاً، لانه خرج مسرعاً فی ثلاثمائة و بضعة عشر رجلاً''۔ لیکن جعفری صاحب لکھتے ہیں: ''لیکن یہ قافلہ پکڑا نہ جاسکا کیونکہ جلدی سے نکل گیا''۔ (ج:۲ ص:۱۷۶)

سبحان مولا! تیری قدرت! حیرت ہوتی ہے کہ قلم کیسے جاہلوں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔

۱۲:.....غزوۂ بدر کے بیان میں علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ اس رات بارش ہوئی، ''فکان علی المشرکین وابلاً شدیداً، و کان علی المسلمین طلاً''۔ یعنی وہ بارش کافروں کے حق میں سخت موسلا دھار بارش رہی اور مسلمانوں کے حق میں شبنم کی طرح۔ لیکن جعفری صاحب کہتے ہیں: ''مشرکین کے لئے بارش مصیبت بن گئی اور مسلمان چونکہ ریت کے ٹیلے پر تھے، انہیں پاک بنادیا''۔ (ج:۲ ص:۱۷۹)

غالباً، جعفری صاحب وابل کو وبال خیال کیا ہے۔ ان کے ذہن میں اگر آیت کریمہ: ''اِن لَّمْ یُصِبْهُ وَابِلٌ فَطَلٌّ'' آجاتی تو وہ غلط ترجمہ نہ کرتے۔

۱۳:.....غزوۂ خیبر کے تذکرہ میں مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ اہل خیبر اپنے پھاوڑے وغیرہ لے کر نکلے، جب انہوں نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھا تو کہہ اٹھے: ''محمد والله، محمد و الخمیس''، یعنی خدا کی قسم، محمد (ﷺ) پورا لشکر لے کر آگئے ہیں۔ ''الخمیس'' عربی زبان میں لشکر کو کہتے ہیں، جس کے پانچ حصے: ہراول، میمنہ، میسرہ، قلب اور ساقہ پورے ہوں، مگر جعفری صاحب کو اتنی عربی کہاں

سے آتی؟ وہ ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''محمدؐ اللہ کی قسم، محمد اور خمس (یعنی مال غنیمت کا حصہ)''۔ (ج:۲ ص:۲۳۳)

بندۂ خدا نے یہ بھی نہ سوچا کہ ابھی جنگ تو ہوئی نہیں، مال غنیمت کا پانچواں حصہ کہاں سے آ گیا تھا؟

۱۴:..... اسی غزوۂ خیبر کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو پرچم دے کر روانہ فرمایا تو ارشاد فرمایا: ''انفذ علی رسلک حتّٰی تنزل بساحتھم''۔ یعنی دھیرے دھیرے چلتے رہو یہاں تک کہ تم ان کے صحن میں اتر جاؤ، مگر جعفری صاحب لکھتے ہیں: ''ان کے علاقہ میں اترنے تک اپنے قاصدوں تک رہنے دو''۔ (ج:۲ ص:۲۳۳)

انہوں نے اپنے زورِ علم سے ''علی رسلک'' کو ''علی رسلک'' بنا دیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صحیفۂ ہمام بن منبہ

مختصر تعارف اور اس کے ترجمہ پر ناقدانہ نظر

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو بھوکے سیر ہونے میں نہیں آتے، ایک علم کا بھوکا، دوسرا مال کا۔ رجال کی کتابیں دیکھی جائیں تو علمی بھوک کے سلسلہ میں سینکڑوں، بلکہ ہزاروں حیرت انگیز واقعات سامنے آتے ہیں۔ اسلاف کے برابر نہ سہی، ہر دور میں اخلاف کو بھی علم کی بھوک پیاس سے کچھ حصہ ملا ضرور ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرت طیبہ اور تاریخ کے موضوع پر محققانہ کتابیں لکھیں تو اس وقت تک ابن کثیر کی نامور کتاب ''البدایة و النهایة'' چھپ کر نہیں آئی تھی۔ علامہ، اس کو دیکھنے کی حسرت ہی دل میں لے کر گئے۔

راقم السطور ایک ادنیٰ سا طالب علم ہے، بزرگوں کی شفقتوں کے نتیجے میں علم کی جو شد بد آئی، اس کے ساتھ علمی تشنگی بھی میراث میں ملی۔ ایک عرصہ تک مصنّف عبدالرزاق، مصنّف ابن ابی شیبہ، صحیح ابن خزیمہ وغیرہ کا شوق دل و دماغ میں جاگزیں رہا، اللہ کا شکر ہے کہ یہ شوق پورا ہوگیا۔ کم و بیش پچاس سال پیشتر، حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ کا مقالہ ''تدوین حدیث'' دیکھنا نصیب ہوا۔ اس میں صحیفۂ صادقہ اور صحیفۂ ابن ہمام بن منبہؒ کا ذکر دیکھا تو دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ کبھی ان کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا سکوں۔ نصف صدی بعد یہ موقع ملا کہ مؤخر الذکر صحیفہ کی زیارت

سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور میسّر آیا، یہ صحیفہ کیا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ کے ۱۳۸ ارشادات عالیہ کا مجموعہ۔ اور جمع کس نے فرمائے؟ مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست فیض پانے والے جلیل القدر صحابی حضرت ابو ہریرہؓ نے، جو صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت میں سب سے زیادہ احادیث نقل کرنے والے ہیں۔ انہوں نے یہ صحیفہ اپنے یمنی شاگرد حضرت ھمّام بن منبہؒ (تابعی) کے لئے مرتب فرمایا تھا۔ بہرحال ہم گنہگاروں کے لئے انتہائی خوشی کا باعث ہے کہ ایک صحابیؓ کا ترتیب دیا ہوا مجموعۂ احادیث دیکھ اور پڑھ لیا۔ فللہ الحمد حمداً کثیراً۔

خیر پور ٹامیوالی ضلع بہاول پور کے قریب، چیلا واہن شریف ایک مردم خیز قریہ ہے، یہاں سے بڑے بڑے جید علماء اور مشائخ اٹھے، ان کے مورث اعلیٰ حضرت حافظ غلام حسین رحمۃ اللہ علیہ، قطب عالم حضرت خواجہ نور محمد قدس سرہ کے خلیفۂ مجاز تھے، ان سے آگے ظاہری و باطنی فیض کا سلسلہ جاری ہوا، حفظ قرآن مجید اس قریہ کے باشندوں کی خاص منقبت ہے، چھوٹے بڑے، مرد، عورتیں سب حافظ۔ تیس سال پہلے تک تو یہی حال تھا، اب خدا جانے کیا صورت ہے؟

حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے ملفوظات میں کہیں دیکھا تھا کہ قطب عالم مہارویؒ کے خلفاء میں سے جس میں جس صحابیؓ کا رنگ ڈھنگ نظر آتا تھا، انہیں اس صحابیؓ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ حضرت خواجہ غلام حسنؒ اپنے شیخ کی روایات بہت زیادہ بیان کرتے تھے، حالانکہ ان کا عرصۂ صحبت نسبتاً کم تھا، اس لئے وہ مہاروی دربار کے ابو ہریرہ کہلاتے تھے۔

حضرت حافظ غلام حسنؒ کے احفاد میں ایک نوجوان جن کا نام غالباً حافظ عبداللطیف تھا، جامعہ بہاول پور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ وہ بیمار رہنے لگے، سر

میں درد کی شدید تکلیف رہتی تھی، بیماری جان لیوا ثابت ہوئی، وفات سے پہلے حافظ صاحب مرحوم کہتے تھے: مجھے حضرت ابوہریرہؓ بلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آؤ میں تمہیں حدیث پڑھاؤں، حافظ صاحب جلالین اور مشکوٰۃ تک پہنچ چکے تھے۔ فللہ درہ!

صحیفۂ ھمام بن منبہ کے علمی جواہر کو معادن سے نکال کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچانے کا سہرا، جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (آف حیدرآباد دکن) کے سر ہے۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ انہوں نے اس کو ایڈٹ کرتے ہوئے، شروع میں تدوین حدیث پر ایک نہایت گراں قدر تحقیقی مقالہ کا اضافہ کیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

اس وقت صحیفۂ ھمام بن منبہ کا جو نسخہ ہمارے ہاتھوں میں ہے، یہ رشید اللہ یعقوب صاحب (آف کراچی) کا بلا قیمت تقسیم کردہ ہے۔ یہ ایک اہل علم دوست سے عاریتاً ہمیں ملا، موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے علم حدیث کی ایک بیش بہا خدمت انجام دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک طالب علم کی حیثیت سے ہمیں اس شکایت کا بھی حق ہے کہ طباعت کے سلسلہ میں تصحیح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی، بیشتر روایات میں اعرابی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور کہیں کہیں تحریف وتصحیف بھی پائی جاتی ہے۔ کراچی میں علماءٗ وفضلاءٗ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر پروف ریڈنگ کا پورا اہتمام کیا جاتا تو شاید کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔

اس سے کہیں بڑھ کر جو افسوس ناک امر ہمارے سامنے آیا ہے، وہ یہ ہے کہ صحیفہ کے عربی مُتونِ احادیث کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے برادر بزرگ جناب محمد حبیب اللہ صاحب نے فرمایا ہے۔ موصوف کے بارے میں حرف آغاز میں بتایا گیا ہے کہ وہ حیدرآباد دکن میں لینڈ

ریکارڈ کے نائب ناظم تھے اور خود ڈاکٹر صاحب نے ان کے نام کے ساتھ "مولانا" کا سابقہ بھی بڑھایا ہے۔ جناب محمد حبیب اللہ صاحب کے علمی حدود اربعہ سے ہم بالکل ناواقف ہیں، کچھ بھی ہو، احادیث کے ترجمہ میں کہیں کہیں فاحش غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ انہوں نے یہ ترجمہ، شدید مصروفیات و علالت کے دوران فرمایا تھا تو کم از کم ڈاکٹر صاحب اس طرف توجہ فرماتے، خصوصاً جب کہ ترجمہ نظر ثانی کے لئے ان کے پاس بھجوادیا گیا تھا تو ان کی ذمہ داری میں اضافہ ہوگیا، وہ حسب ضرورت ترجمہ کی اصلاح فرمادیتے تو جگہ جگہ اس طرح کی غلطیاں نہ ہوتیں، جن کا نمونہ قارئین آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ برادر بزرگ کے احترام سے، دین کا علم زیادہ خیر خواہی کا مستحق تھا، اس لئے قارئین..... یا طلبۂ علم..... جناب ڈاکٹر صاحب کی بے اعتنائی کا شکوہ کریں تو وہ حق بجانب ہوں گے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق ان سطور کے لکھے جانے تک ڈاکٹر صاحب بقید حیات ہیں اور بسلسلۂ علاج امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ (وما تدری نفس ماذا تکسب غدا)..... راقم دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں شفاء کاملہ نصیب فرمائیں اور دینی خدمات کے لئے انہیں بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں۔

اب ہم آئندہ صفحات میں چند احادیث کے ترجمہ کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے، مطبوعہ نسخہ میں جو ترجمہ دیا گیا ہے، وہ جناب ڈاکٹر صاحب کے برادر بزرگ کی طرف سے ہے البتہ ڈاکٹر صاحب کا نظر فرمودہ ہے۔ آئندہ سطور میں اسے نقل کرتے ہوئے صرف "ترجمہ" کا لفظ لکھ دیں گے، قارئین خود سمجھ لیں گے۔

حدیث نمبر ۵۴: "(۱) و الله لقيد سوط احدكم من الجنة خير له مما

بین السماء و الارض"۔

ترجمہ: "تم میں سے ایک شخص ہے جس کے کوڑے کی ڈوری (جو جنت میں ملے گی) آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے اس سے بہتر ہے"۔

قابل توجہ:

ایک تو واللہ کا ترجمہ نہیں دیا گیا۔ دوسرا، مترجم بزرگ نے لفظ "قید" کو بفتح القاف (قَید) پڑھا۔ قید کے معنیٰ ہتھکڑی کے ہوتے ہیں۔ یہاں ہتھکڑی کا لفظ انہیں بے معنیٰ نظر آیا تو اس کی بجائے "ڈوری" لکھ کر کام چلانے کی کوشش کی گئی، ان کا خیال یہ ہے کہ اہل جنت کو اس قسم کے چابک دیئے جائیں گے جس طرح ٹریفک کے سپاہی یا پولیس کے ملازم ہاتھ میں لئے پھرتے ہیں۔ وہ ہاتھوں میں جو کوڑا لئے پھرتے ہیں، ایک طرف سے ان کے کالی ڈوری لگی ہوتی ہے۔ یہ تمام تر خیال غلط ہے۔ دراصل یہ لفظ "قِید" بکسر القاف ہے جس کے معنیٰ ہیں مقدار۔ خود متعدد احادیث میں "قَید" کی بجائے "موضع" اور کہیں "قاب قوس" کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک اور حدیث میں "قید" کا لفظ بمعنیٰ مقدار آیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "من ظلم قید شبر من الارض طوقه من سبع ارضین"۔ یعنی جس شخص نے بمقدار ایک بالشت، کسی کی زمین ناحق لے لی، اسے سات زمینوں سے اس کا طوق پہنایا جائے گا۔

مترجم بزرگ سے تیسری غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ایک نمبر کا نشان دے کر نیچے حاشیہ میں لکھا: "ایک غریب مگر نکوکار صحابی کی تعریف ہے"۔ یہ حاشیہ آرائی بھی غلط ہے۔ وہ یہ سمجھے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد کسی ایک فرد کے حق میں

منقبت کے طور پر فرمایا۔ حالانکہ بات یوں نہیں ہے۔ آنحضور ﷺ کا مقصد، سرزمین جنت کی تعریف کرنا ہے۔ حافظ منذریؒ کتاب ''الترغیب والترہیب'' میں فرماتے ہیں:

''و معنی الحدیث، و بقدر قوس احدکم او قدر الموضع الذی یوضع فیه سوطه خیر من الدنیا و ما فیها''۔

اب حدیث بالا کا صحیح ترجمہ یوں ہوگا: اللہ کی قسم! تم میں سے کسی کو جنت میں ایک چابک کے برابر جو جگہ ملے گی، وہ اس سے بہتر ہے جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔

حدیث نمبر ۶۲: ''ان من الظلم مطل الغنی و ان اتبع احدکم علی ملیء فلیتبع''۔

ترجمہ: ''مالدار کا وعدے کو ٹالتے رہنا بھی ایک ظلم ہے۔ تم میں سے کسی کا پیٹ بھرے سے پالا پڑے تو اس کا پیچھا کرے''۔

قابل توجہ:

خط کشیدہ جملۂ حدیث کا ترجمہ غلط ہے، اب کوئی بتائے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ لگتا ہے کہ مترجم بزرگ خود ہی اس کا مطلب نہیں سمجھے، دراصل وہ مشہور فقہی اصطلاح ''الحوالہ'' سے ناواقف ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے فرمان گرامی کا حاصل یہ ہے:

۱:.....ایک شخص، کسی کا مقروض ہے اور وہ فراخ دست ہونے کے باوجود قرض ادا نہیں کرتا، تو یہ اس کی طرف سے زیادتی اور ظلم شمار ہوگا۔

۲:..... اگر کوئی شخص مقروض ہے اور وہ قرض ادا نہیں کرسکتا، دوسری طرف

قرض خواہ کا مطالبہ سخت ہوجاتا ہے، اب اگر وہ مدیون، اپنے قرض خواہ کو کسی دوسرے صاحب حیثیت کی طرف پھیر دیتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر راضی ہوجائے۔

''اتبع'' باب افعال سے واحد مذکر غائب فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے، جس کا لفظی معنیٰ ہے ''پیچھے لگادیا جائے''۔ شروح حدیث میں اس کا ترجمہ ''احیل'' سے کیا گیا ہے اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: ''درپے فرستادہ شود یعنی حوالہ کردہ شود''۔

حدیث نمبر ۷۰: ''کل سلامیٰ من الناس علیه صدقة کل یوم تطلع علیه الشمس''۔

ترجمہ: ''لوگوں کا چھوٹی سی ہڈی (کسی کو) دینا بھی اس وقت تک کے لئے نیکی ہے جب تک کہ آفتاب طلوع ہوتا رہے گا''۔

قابل توجہ:

''سُلامیٰ'' کے لفظی معنیٰ ہیں انگلیوں کے جوڑ۔ شارحین حدیث لکھتے ہیں: ''المفصل''۔ دیکھئے ریاض الصالحین، شرح مسلم از نوویؒ وغیرہ۔ جناب مترجم سے اس ترجمہ میں کئی غلطیاں ہوئی ہیں۔ ''سُلامیٰ'' کا ترجمہ ہڈی سے کر کے ارشاد گرامی کو بے جان سا کردیا ہے، اور اس ایک لفظ کا ترجمہ غلط ہوجانے سے آگے بھی ترجمہ غلط ہوتا چلا گیا ہے۔ ہم اس فرمان کو سمجھنے کے لئے صحیح مسلم شریف کی دو اور حدیثیں نقل کرتے ہیں:

اول:..... ''یصبح علی کل سلامی من احدکم صدقة. فکل تسبیحة صدقة، و کل تحمیدة صدقة، و کل تهلیلة صدقة، و کل تکبیرة

صدقة، و امر بالمعروف صدقة، و نهی عن المنکر صدقة، و تجزئ من ذلک رکعتان من الضحیٰ''۔

ترجمہ:.....'' تم میں سے ایک آدمی کے ہر ہر جوڑ پر صبح کو صدقہ لازم ہوتا ہے، تو اس کا ہر سبحان اللہ کہنا بھی صدقہ اور خیرات ہے، ہر الحمد للہ کہنا بھی خیرات ہے، ہر لا الہ الا اللہ کہنا خیرات ہے، ہر اللہ اکبر کہنا خیرات ہے، نیکی کے لئے کہنا خیرات ہے، برائی سے روکنا خیرات ہے، اور چاشت کے وقت دو رکعت پڑھ لے تو ان تمام کاموں سے کافی ہوجائے گا''۔

دوم:.....''خلق کل انسان من بنی آدم علی ستین و ثلاثمائة مفصل، فمن کبر الله و حمد الله، و هلل الله، و سبح الله، و استغفر الله، و عزل حجرا من طریق الناس، او شوکة او عظما عن طریق الناس، او امر بمعروف او نهی عن منکر، عدد الستین و الثلاثمائة فانه یمسی یومئذ و قد زحزح نفسه عن النار''۔

ترجمہ:.....'' اولاد آدم میں سے ہر شخص کی پیدائش، تین سو ساٹھ جوڑوں پر ہوئی ہے، تو جو شخص اللہ اکبر کہے گا، الحمد للہ کہے گا، لا الہ الا اللہ کہے گا، سبحان اللہ کہے گا، استغفر اللہ کہے گا، لوگوں کے راستے سے پتھر ہٹادے گا، یا کوئی کانٹا یا ہڈی ہٹادے گا، نیکی کی دعوت دے گا، برائی سے روکے گا، تین سو ساٹھ جوڑوں کی تعداد کے برابر، تو اس کا وہ دن یوں بسر ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا چکا ہوگا''۔

ان دونوں حدیثوں سے زیر نظر حدیث کا مطلب واضح ہوجاتا ہے کہ ہر شخص پر اس کے اعضاء کے جوڑوں کے برابر ہر روز، جب تک کہ اس پر سورج طلوع ہوتا رہے گا، صدقہ لازم ہے۔

حدیث نمبر۷۲: یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو مالدار شخص اپنے مال میں سے زکوٰۃ نہیں ادا کرتا، قیامت کے روز وہ مال ایک گنجے سانپ کی شکل اختیار کرلے گا، مالک اس سے بھاگنا چاہے گا، مگر وہ اسے پکڑ لے گا اور اس سے کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں۔ (آگے حدیث میں ہے) کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''و الله لن یزال یطلبه حتی یبسط یده فیلقمها فاه''۔

ترجمہ: ''اللہ کی قسم! وہ اس کا پیچھا کرتا ہی رہے گا یہاں تک کہ (اس زکوٰۃ نہ دینے والے) شخص کو اپنے قبضے میں لاکر اپنا نوالہ بنالے گا''۔

قابل توجہ:

مترجم بزرگوار کو خط کشیدہ قطعۂ حدیث کا معنیٰ مطلب سمجھنے میں بڑا مغالطہ لگا، انہوں نے ''یبسط یده'' کا ترجمہ کیا ہے وہ اسے اپنے قبضے میں لے لے گا، حالانکہ نہ تو منقولہ الفاظ اس ترجمہ کو درست قرار دیتے ہیں، نہ دوسری احادیث اس کی تائید کرتی ہیں۔ صحیح ترجمہ اس طرح ہے:

''یہاں تک کہ وہ شخص اپنا ہاتھ پھیلا دے گا اور اسے (یعنی ہاتھ کو) اس کے (یعنی سانپ کے) منہ میں دے دے گا''۔

یہی مضمون دوسری احادیث میں بھی آیا ہے، چنانچہ مسلم شریف میں ہے: ''فاذا رأی ان لا بد منه سلک یده فی فیه فیقضمها''۔ یعنی جب زکوٰۃ نہ دینے والا آدمی دیکھے گا کہ اب اس کے لئے کوئی چارہ نہیں رہا تو وہ اپنا ہاتھ سانپ کے منہ میں دے دے گا اور وہ اسے چبا ڈالے گا۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے: ''حتی یلقمه اصابعه''، یہاں تک وہ

اپنی انگلیوں کو اس کے منہ میں دے دے گا۔

حدیث نمبر۸۲: ''و الذی نفس محمد بیده لو ان عندی احدا ذهبا لاحببت ان لا یأتی علی ثلاث لیال و عندی منه دینار اجد من یتقبله منی لیس شئ ارصده فی دین علیّ''۔

ترجمہ: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، اگر میرے پاس احد کے برابر سونا ہوتا تو میں اس بات کو پسند کرتا کہ تین رات گزرنے سے پہلے اگر کوئی اس کو لینے والا ہو، تو ایک دینار بھی باقی نہ رکھوں، میں کوئی چیز باقی رکھ کر اپنے کو (اللہ کے سامنے) مقروض نہیں بنانا چاہتا''۔

قابل توجہ:

حدیث شریف اور ترجمہ کے خط کشیدہ جملوں کو ملاحظہ فرمایئے۔ فرمان پاک کو بالکل بے معنیٰ اور مہمل بنادیا گیا ہے۔ مترجم بزرگ، عربی گرائمر کے اس قانون سے ناواقف ہیں کہ ''لیس'' فعل ناقص ہونے کے علاوہ، ''الا'' کی طرح کلمۂ استثناء بھی ہے اور یہاں یہ اسی معنیٰ میں استعمال ہو رہا ہے۔ خط کشیدہ عربی جملہ کا صحیح ترجمہ یوں ہے: ''سوائے اس چیز کے، جو میں اپنے ذمہ قرض کے سلسلہ میں رکھ لوں''۔

یہ بھی معلوم رہے کہ جب ''لیس'' بطور کلمۂ استثناء استعمال ہو، اس کے بعد مستثنیٰ منصوب پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا حدیث کے الفاظ میں ''لیس شیئاً'' پڑھا جائے گا۔

حدیث نمبر۸۶: ''اللهم انی اتخذ عنک عهدا لن تخلفه. انما ان بشر، فای المؤمنین اذیته او شتمته او جلدته او لعنته، فاجعلها له صلوٰةً و

زکوٰۃً و قربۃً تقربہ بھا یوم القیامۃ''۔

ترجمہ: ''یا اللہ! میں تجھ سے ایک عہد لیتا ہوں، تو اس کے خلاف نہ ہونے دے، میں تو ایک انسان ہوں، وہ یہ کہ نہ میں نے کسی مؤمن کو ایذا دی ہے یا اس کو گالی دی ہے، یا اس کو مارا ہے، یا اس پر لعنت بھیجی ہے، تو اس کو رحمت اور پاکیزگی اور قربت بنادے جس کے ذریعہ وہ قیامت کے دن (اللہ سے) تقرب حاصل کرے''۔

قابل توجہ:

۱:..... ''لن تخلف'' فعل مضارع منفی مؤکد ہے۔ اس کا ترجمہ فعل نہی کے طور پر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۲:..... ترجمہ میں ''نہ'' کا لفظ بلاوجہ بڑھایا گیا ہے، الٹا بات بے تکی اور مہمل سی بن گئی ہے، جب ایذا دینے، گالی دینے، مارنے یا لعنت بھیجنے کی نفی کردی گئی تو پھر کس چیز کو رحمت اور قربت بنادینے کی دعا کی جارہی ہے؟

۳:..... ''وہ ..... تقرب حاصل کرے''، ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ ''تقرب'' باب تفعیل سے واحد مذکر مخاطب، باب تفعیل کا صیغہ ہے اور آگے ''ہ'' ضمیر مفعول کی ہے، پوری حدیث کا صحیح ترجمہ یوں ہوگا:

''اے اللہ میں تجھ سے ایک عہد لیتا ہوں (حدیث کی دوسری کتابوں میں ''اتخذت'' بصیغۂ ماضی آیا ہے، پھر ترجمہ ہوگا، میں تجھ سے عہد لے چکا ہوں) جس کی تو ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ میں ایک انسان ہوں (اس لئے اگر) کسی مسلمان کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچے، یا میں اسے گالی دوں یا مارلوں یا لعنت بھیجوں، تو تو اسے اس کے حق میں نماز، زکوٰۃ اور کسی کار ثواب میں تبدیل کردے جس کے باعث تو

قیامت کے دن اسے اپنا قرب نصیب فرمائے''۔

حدیث نمبر ۸۹: یہ ایک طویل حدیث ہے جس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''و الذی نفس محمد بیدہ لا ینتھب احدکم نھبۃ ذات شرف یرفع الیہ المؤمنون اعینھم فیھا، و ھو حین ینتھبھا مؤمن''۔

ترجمہ: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ کوئی شخص عزت دار ہوکر (نکاح میں کھجور مصری) اس طرح لوٹے گا کہ لوگوں کی نظروں میں نکو ہو جائے تو اس حال میں وہ مؤمن نہیں ہوتا''۔

قابل توجہ:

مترجم بزرگ کو پہلا مغالطہ یہ ہوا کہ وہ ''ذات شرف'' کو ''احدکم'' کی صفت سمجھے، انہوں نے یہ بھی خیال نہ فرمایا کہ ''احدکم'' مذکر کا صیغہ ہے۔ اس کی صفت بھی مذکر ''ذو'' کا لفظ آنی چاہئے اور پھر موصوف صفت کو اکٹھے آنا چاہئے تھا، ''نھبۃ'' کا لفظ جو مفعول واقع ہو رہا ہے، بعد میں آتا۔ درحقیقت ''ذات شرف''، ''نھبۃ'' کی صفت ہے۔

''نھبۃ'' کا لفظ اگر بضم النون پڑھا جائے تو مفعول بہ بنے گا، اگر بفتح النون پڑھا جائے تو مفعول مطلق ہوگا۔ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی رہتا ہے۔

مترجم بزرگ کی تشریح بھی مضحکہ خیز ہے کہ اس فرمان رسولؐ کا تعلق نکاح میں چھوارے یا شکر لوٹنے سے ہے۔ یہ تو ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ والی بات ہوئی، بھلا لینڈ آفیسری اور حدیث فہمی کا کیا جوڑ؟ دراصل اس عبارت کے سیاق و سباق کو دیکھا

جائے تو بات کچھ اور نکلتی ہے، اس حدیث شریف میں زنا کاری، چوری، شراب نوشی، غارت گری اور خیانت جیسے قبیح جرائم کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی مسلمان ان میں سے کوئی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ آج سڑکوں پر، بازاروں میں، بسوں اور ریل گاڑیوں میں ان جرائم کی جو بھر مار ہے، کیا یہ امت مسلمہ کے کرتوت نہیں؟ یہ جرائم خود اس بات کا منہ بولتا ثبوت نہیں کہ جو لوگ ان کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ دولت ایمان سے محروم ہوکر ایسا کر گزرتے ہیں۔

اب حدیث شریف کے منقولہ بالا ٹکڑے کا صحیح ترجمہ سن لیجئے:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، جب کوئی آدمی بڑے پیمانہ پر کسی کا مال لوٹ لیتا ہے کہ مسلمان آنکھیں اٹھا اٹھا کر اسے دیکھتے رہ جاتے ہیں، تو وہ ایمان کی حالت میں نہیں لوٹتا''۔

حدیث نمبر ۹۵: ''لان یلج احدکم بیمینه فی اهله اثم له عند الله من ان یعطی کفارته التی فرض الله''۔

ترجمہ: ''تم میں سے کسی کا قسم کھانے کی وجہ سے اپنے اہل وعیال کے پاس نہ جانا، اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کفارہ ادا کردے جس کو (قسم کے توڑنے پر) اللہ نے فرض کیا ہے''۔

قابل توجہ:

ترجمہ اس حد تک غلط کیا گیا ہے کہ شریعت کا حکم بالکل الٹا ہوگیا ہے، اس کا موجب دو مغالطے ہیں:

ایک تو یہ کہ حدیث شریف کے پہلے لفظ ''لان'' میں لام تاکید کو ''لا'' نافیہ سمجھ لیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم بزرگ کو عربی گرائمر سے واجبی حد تک بھی واقفیت نہیں ہے۔

دوسرا یہ کہ ''اثم'' کے لفظ کو ''بالتاء المثناۃ'' پڑھا گیا ہے، حالانکہ یہ حرف ''ثاء مثلثۃ'' ہے۔

یہ حدیث صحاح ستہ کی متعدد کتابوں میں موجود ہے اور سب میں ''اثم'' کا لفظ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کو علم حدیث سے چنداں مناسبت نہیں ہے۔ بہرحال صحیح ترجمہ یوں ہے:

''تم میں سے ایک شخص اپنے گھر والوں کے بارے میں اپنی قسم کی پابندی کرے، یہ اس سے زیادہ گناہ کا کام ہے کہ وہ قسم کو توڑ کر اللہ تعالیٰ کا مقرر فرمودہ کفارہ ادا کرے''۔

شارح مشکوٰۃ، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس حدیث کی شرح میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہاں دیا جاتا ہے:

''اس حدیث کا مضمون وہی ہے جو دوسری ان احادیث کا ہے جن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کوئی شخص ایک بات کی قسم کھالے اور پھر دوسرا پہلو اسے بہتر نظر آئے (مثلاً کوئی آدمی ایسی کوئی قسم کھالے جس سے گھر والوں کا نقصان ہوتا ہو، ان کی حق تلفی ہوتی ہو) تو وہ دوسرے پہلو پر عمل کرلے اور قسم کا کفارہ دے دے''۔

(اشعۃ اللمعات ج:۳ ص:۲۱۳)

ایک علمی افادہ:

صحیفۂ شریفہ میں حدیث نمبر ۹۶ اور اس کا ترجمہ ان الفاظ سے درج ہے:

''قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: اذا اكره الاثنان على اليمين فاستحياهما فاسهم بينهما''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دو لوگ قسم کھانے کے لئے مجبور کئے جائیں اور دونوں حیا کریں تو ان کے درمیان قرعہ ڈالو''۔

راقم الحروف کو حدیث کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے ان الفاظ اور ترجمہ کی صحت میں شک گزرا، اب تلاش شروع کی کہ صحاح ستہ یا دیگر مشہور کتب میں یہ روایت کہیں مل جائے، چنانچہ سعی کے بعد یہ روایت مسند احمد میں مل گئی، راقم کے پاس مسند کا وہ نسخہ ہے جو تبویب شدہ اور ''الفتح الربانی'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر شیخ احمد عبدالرحمٰن البناؒ کی تعلیقات ''بلوغ الامانی'' کے نام سے موجود ہیں۔

زیر نظر روایت مسند احمد میں ان الفاظ سے درج ہے:

''اذا اكره الاثنان على اليمين فاستحييا، فليستهما عليه''.

(باب القضاء بالقرعة ج:۱۵ ص:۲۱۷)

ترجمہ:..... ''جب دو آدمیوں کو قسم دینی پڑے اور دونوں اس سے شرمائیں، تو وہ اس پر قرعہ اندازی کرلیں''۔

صاحب تعلیقات، شیخ بناؒ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

''اگر دو آدمیوں کا مقدمہ، حاکم کے پیش ہو اور دونوں کے پاس گواہ نہ ہوں یا دونوں کے پاس گواہ موجود ہوں، تو انہیں قسم کے لئے کہا جائے گا۔ اب اگر دونوں

قسم کے لئے آمادہ ہوجائیں یا دونوں پس و پیش کریں تو حاکم ان میں قرعہ اندازی کرائے گا، جس کے نام قرعہ نکل آئے، وہ حلف اٹھائے گا، اور متنازعہ چیز کو لے جائے گا۔''ایهما خرجت له القرعة حلف و اخذ ما ادعاه''۔ (حوالہ مذکور)

تو صحیفہ کے موجودہ نسخہ میں غلطی یہ آگئی ہے کہ''استحییا'' کے بعد''هما'' ضمیر تثنیہ درج ہے، حالانکہ''ھا'' ضمیر واحد مؤنث ہونی چاہئے جس کا مرجع''یمین'' ہے، جیسا کہ مسند احمد میں ہے۔

ثانیاً یہ بھی معلوم رہے کہ مسند میں روایت کے آخری الفاظ مطبوعہ صحیفہ سے مختلف ہیں، حالانکہ مسند میں بھی یہ روایت اسی سند''معمر عن همّام بن منبّه عن ابی هریرة'' سے منقول ہے۔

قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہی روایت، اسی سند سے، تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ سنن ابی داؤد، کتاب القضاء کے باب''الرجلین یدعیان و لیس بینهما بینة'' میں بھی موجود ہے۔ زیادہ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔